بلوچستان: ریاست بمقابلہ قوم

فریڈرک گریر

CARNEGIE ENDOWMENT

FOR INTERNATIONAL PEACE

WASHINGTON DC ▪ MOSCOW ▪ BEIJING ▪ BEIRUT ▪ BRUSSELS

خلاصہ

رقبے کے اعتبار سے پاکستان کا سب سے بڑا لیکن آبادی کے حوالے سے سب سے چھوٹا صوبہ بلوچستان بتدریج لاقانویت کی طرف بڑھ رہا ہے۔سال دوہزار پانچ سے پاکستانی سیکورٹی فورسز نے بلوچ قوم پرست تحریک کو سختی سے دبا یا ہے جس کے نتیجے میں صوبے میں لسانی اور فرقہ وارانہ تشدد میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود پاکستانی سیکورٹی فورسز بغاوت کو مکمل طور پر کچلنے میں ناکام ہوگئے ہیں اور یوں خون خرابہ کا یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ ریاستی حربوں کی وجہ سے بلوچستان میں وہ سماجی ڈھانچہ جو انتہاپسندرجحانات کو روک سکتا تھا کمزور ہوگیا ہے۔ اب ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کی وجہ سے افغانستان کے غیر مستحکم ترین صوبوں سے ملحقہ بلوچستان کے اس خطے میں حالات مزید بگڑ سکتے ہیں[1]۔صرف سیاسی حل کے ذریعے ہی افراتفری کے اس ماحول کو ختم کیا جاسکتا ہے۔

اہم نکات

الف: جب تک ریاست نے بلوچستان میں اپنی حکمرانی قائم کرنے کی خاطر سخت حربے استعمال نہیں کئے ، اس وقت تک بیشتر بلوچ قوم پرست جماعتوں نے سخت گیر موقف نہیں اپنا یا تھا اور نا ہی وہ آزادی کا مطالبہ کررہی تھیں۔ وہ پاکستان کے وفاقی ڈھانچے کے اندر رہ کر زیادہ سیاسی خود مختاری اور معاشی اور معاشرتی حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد کررہی تھیں۔

ب: ریاستی ادارے بشمول سپریم کورٹ قانون نافذ کرنے والےاداروں کو قانون کا احترام کرنے پر راضی نہیں کرسکے ہیں۔ تاہم ان اداروں نے بلوچستان میں ہونے والے تشدد اور نا انصافیوں کی طرف خاصی آگاہی بیدار کی ہے۔

ج۔ بیشتر پاکستانیوں کے خیال میں علحیدگی پسندوں کے مقابلے میں قانون نافذ کرنے والے ادارے قومی یکجہتی اوراستحکام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

د۔ مذاکرات کے ذریعے مسئلے کا سیاسی حل ڈھونڈنا ممکن ہے۔ قوم پرست تحریک کمزور اور منقسم ہےاور زیادہ تر بلوچ آزادی کے انتہا درجے کے مطالبے کے مقابلے میں خود مختاری کے حق میں ہیں۔ چوں کہ اسلام آباد بندوق کی نوک پرقوم پرستوں کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہوسکا ہے تو شایداب وہ ایک سیاسی حل پر آمادہ ہو۔

حل کی تلاش

الف: قوم پرست جماعتوں کو چاہئیے کہ وہ مئی میں منعقد ہونے والے عام انتخابات میں حصہ لیں۔ صرف ان کی شمولیت ہی سے بلوچستان کی انتظامیہ کو قانونی اہمیت حاصل ہوگی۔ ایک جائز اور قابل

[1] ۱۔ تین لاکھ سینتالیس ہزار ایک سو نوے مربع کلو میٹر پر پھیلا ہوا بلوچستان پاکستان کے کل رقبے کا ۴۳ فیصد ہے لیکن یہ آبادی کا صرف پانچ فیصد ہے

اعتبار بلوچ حکومت ہی صوبے میں اپنی گرفت جماسکتی ہے، صوبے میں جاری تشدد میں کمی لاسکتی ہے اور وفاقی سطح پر بلوچستان کے حقوق کی وکالت کرسکتی ہے۔

ب۔ قانون نافذ کرنے والے پاکستانی اداروں کو چائیے کہ وہ انسانی حقوق کا احترام کریں اور تمام ڈیتھ اسکوڈ کا خاتمہ کریں، ماروائے عدالت ہلاکتوں اور جبری گمشدگیوں کا سلسلہ ختم کریں۔ جب تک انسانی حقوق کی یہ پامالیاں جاری رئیں گی تب تک سنجیدہ سیاسی حل تلاش کرنا ناممکن ہوگا۔

ج۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں پر لازم ہے کہ وہ مختلف پرتشدد گروہوں کی پشت پناہی ترک کریں اور فرقہ وارانہ تشدد کے خاتمے کے لئے جائز قانونی طرایق استعمال کریں۔

د۔ اقوام متحدہ کو چائیے کہ اپنا ایک مستقل مشاہداتی مشن بلوچستان بھیجے جو انسانی حقوق کی صورتحال کا جائزہ لے۔ اگر سیکورٹی اسٹبلشمنٹ اپنے پالیسی پر نظر ثانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو ایک ایسے مشن کے ذریعے بلوچستان کے مسئلے کو شفاف طریقے سے دیکھنے کا موقع ملے گا اور اس سے احتساب و اعتماد کا ماحول بھی قائم کیا جاسکے گا۔

تعارف

سال دوہزار پانچ میں بلوچستا ن میں شورش برپا ہوا۔ بلوچستان پاکستان کے چار صوبوں میں آبادی کے لحاظ سے سب سے چھوٹا اور رقبے کے اعتبار سے سب سے بڑا صوبہ ہے جس کی سرحدیں پاکستان سمیت ایرا ن اور افغانستان کے ساتھ ملتی ہیں۔ کئی مہینوں سے جنوب مغربی صوبے میں قدرتی گیس کی قیمت، اضافی فوجی چھاونیوں کی تعمیراورگوادر کی بندرگاہ کی تعمیر کے حوالے سے حالات کشیدہ ہوتے جارہے تھے۔ مقامی لوگوں کو خدشہ تھا کہ گوادر پورٹ کی تعمیر سے غیر مقامی لوگوں کو زیادہ فائدہ ہوگا۔ چوں کہ اس سے قبل بھی بلوچ قوم پرستوں اور پاکستان کی وفاقی حکومتوں کے درمیان کم از اکم چار مرتبہ ٹکراو ہوا تھا تو شروع میں یہی تصور کیا جارہا تھا کہ تشدد کی یہ لہر بھی ماضی کی طرح بلوچوں کی طرف سےاپنے غم و غصے کے اظہار کا ایک روایتی طریقہ ہے۔[2]

شورش کا آغاز بلوچوں کے چھوٹے سے گاوں سوئی میں ایک خاتون ڈاکٹر شازیہ خالد کے ساتھ ہونے والے جنسی تشدد کے ایک واقعہ سے ہوا۔ ایک فوجی مبنیہ طور پر جنسی تشدد کے اس واقعے میں ملوث تھا لیکن اسے سرے ہی سے گرفتار نہیں کیا گیا۔ جب فوج نے مبینہ طور پر اس واقعے کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کی تو بگٹی قبائلی سے تعلق رکھنے والے افراد نےڈیفنس سیکورٹی فورسز اور فرنٹئیر کانسٹبلری پر حملوں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔

شازیہ خالد کے ساتھ ہونے والے جنسی تشدد کے واقعے نے جلتی پر تیل کا کام کردیا اوریوں اس سے ایک ایسی آگ بھڑک اٹھی جو پورے علاقے میں پھیل گئی۔ گذشتہ کئی مہینوں سے فوجی حکومت اور

[2] ۲۔ پاکستان کی آزادی کے بعد پاکستان کی وفاقی ریاست اور بلوچ قوم پرست چار مواقع پر آمنے سامنے ہوئے ہیں یعنی ۱۹۵۸،۱۹۳۸، ۱۹۷۳ تا ۱۹۷۷

صوبائی حکومت کے درمیان تعلقات صوبائی خود مختاری، وسائل کی تقسیم، بین الصوبائی نقل و عمل اور مقامی زبان و ثقافت کے تحفظ جیسے امور کی وجوہات پر کشیدہ تھے۔ یہ شکایات نئی نہیں تھیں۔ تاہم ڈیرہ بگٹی میں حالات زیادہ ہی کشیدہ تھے کیوں کہ ایک تو یہ علاقہ گیس کی قدرتی معدنیات سے مالا مال تھا تو دوسری طرف بگٹی قبیلے کے سربراہ اور سابق وزیر مملکت برائے داخلہ اور گورنر نواب اکبر بگٹی اس بات پر بضد تھے کہ ان کے قبیلے کو گیس کی رائلٹی کی مد میں زیادہ تر حصہ ملے۔

اس وقت تک پاکستانی اہلکاروں نے کہا کہ بلوچستان کا جھگڑا محض چند مفاد پرست سرداروں کی پیداوار ہے۔ حکومت نے کہا کہ تین ایسے سردار ہیں جو صوبے کے بیشتر وسائل پر اپنا قبضہ جمانا چاہتے ہیں، علاقے میں ترقی کے مخالف بھی ہیں تاکہ صوبے پر ان کا قبضہ بدستور قائم و دائم رہے اور وہ صوبے میں جاگیردارانہ نظام کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ پاکستان فوج نے بلوچ قوم پرست رہنماوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا اور اس بات کو بھی خارج از امکان قرارد یا کہ یہ تنازعہ ایک طویل جنگ کی شکل اختیار کرے گا۔

لیکن سات سال گزرنے کے باوجود یہ جنگ تاحال جاری ہے۔ سال دوہزار آٹھ میں جنرل مشرف کے اقتدار سے بے دخل ہونے اور ان کے بعد آنے والی حکومت کی طرف سے خیر سگالی کے بیانات کے باوجود ایک جامع سیاسی حل کی طرف پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ مذاکرات سے پہلے بلوچ مزحمت کاروں نے یہ شرائط پیش کئے کہ صوبے میں تمام فوجی آپریشن کا خاتمہ کیا جائے اور خفیہ ادارے اپنی سرگرمیاں روک دیں لیکن ان کے دونوں شرائط تسلیم نہیں کئے گئے۔

آج بلوچستان بتدریج لیکن واضح طور پر لاقانونیت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ بلوچستان کا مسئلہ لسانی، فرقہ وارانہ، علیحدگی پسند اور انتہا پسند تشدد کا ایک مرکب ہے جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے[3]۔ صوبے میں بالخصوص امن و امان کی صورت خطرناک حد تک بگڑتا جارہا ہے۔ حتیٰ کہ صوبائی وزیراعلیٰ نواب محمد اسلم رئیسانی جنھیں خود بلوچستان میں ہونا چائیے تھا اپنی جان کو درپیش خطرات کے پیش نظر زیادہ تر وقت اسلام آباد میں گزارتے تھے۔ آخر کار انھیں ان کے عہدے سے بر طرف کردیا گیا۔

پاکستان فوج ٹارگٹ کلنگ اور اغوا کے واقعات کی پشت پناہی کرنے کے باوجود تاحال مسلح تنظیموں اور قوم پرست تحریک کو جڑ سے اکھاڑنے میں کامیاب نہیں رہی ہے۔ فوج کی کوشش رہی ہے کہ وہ بلوچ تحریک کو جرائم پیشہ گروہوں اور دہشت گردوں کے ساتھ تعبیر کرے۔

یہ سچ ہے کہ ہر ریاست علیحدگی پسند خیالات کی مخالفت کرتی اور اور پاکستان اس رویے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اگر نام نہاد '' بلوچ قوم پرستی'' کا طائرانہ جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سال دوہزار کے قریب صوبے میں چند ایسے گروہ ضرور تھے جوعلیحدگی پسندانہ سوچ رکھتے تھے

[3] ۳۔ نوید حسین '' فڈیلنگ وائل بلوچستان برنز'' روزنامہ ایکسپریس ٹربیون، پندرہ اگست۲۰۱۲

لیکن وہ محض اقلیت میں تھے۔ بیشتر (اگر سب نہیں) کارکناں اس بات پر اکتفا کرچکے تھے کہ بلوچستان کا مستقبل وفاق پاکستان ہی سے وابستہ ہے۔ وہ پاکستان کے آئینی دائرے میں رہ کر زیادہ خود مختاری طلب کررہے تھے اور چاہتے تھے کہ حکومت بلوچوں کے معاشی و سماجی حقوق کا احترام کرے۔ ریاست کی بے رحمانہ پالیسیوں کا یہ نتجہ نکلا کہ ''قوم پرست'' تحریک میں شامل بیشتر لوگوں نے سخت گیر موقف اختیارکرلیا۔

اس وقت صوبے کی اکثریتی آبادی زیادہ صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کرتی ہے نا کہ آزادی۔ بلوچ قوم پرست مختلف گروہوں میں تقسیم ہے اور چند گروہ پاکستان کے وفاقی ڈھانچے میں رہ کر خود مختاری حاصل کرنا چاہتے ہیں تاہم وہ پاکستان سے مکمل آزادی حاصل نہیں کرسکیں گے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے فوج سختی کررہی (کہ بلوچستان میں آزادی کا مطالبہ نہیں کیا جائے)اس سے محض اس طرح کے مطالبات کو مزید تقویت مل رہی ہے۔

پاکستان کی سیکورٹی اسٹبلشمنٹ بلوچ سماجی ڈھانچے کو تباہ کرنے میں کامیاب ہوئی ہےلیکن اس کے باوجود وہ صوبے میں اپنا رٹ قائم کرنے میں کامیاب ہوسکی ہے اور نا ہی متبادل سماجی ڈھانچے متعارف کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ دریں اثنا سیکورٹی اسٹبلشمنٹ نے صوبے میں لسانی کشیدگی میں مزید اضافہ کیا ہے۔ مزحمت کاروں نے پاکستان کے وفاقی ایجنسیوں کے لئے کام کرنے والوں کے ساتھ ساتھ عام غیر بلوچ شہریوں پر حملے شروع کئے ہیں۔ اب سیکورٹی اسٹبلشمنٹ کا کنٹرول اپنے ہی پر تشدد گروہوں پر ختم ہو گیا ہے۔

مذہبی انتہا پسندی کو فروغ دے کر وفاقی حکومت نے صوبے پر اپنا قبضہ زیادہ مضبو ط نہیں کیا ہے بلکہ ا س سے خود حکومت کی رٹ کمزور ہوگئ ہے۔ ایک ایسا علاقہ جہاں مذہبی جنونیت ماضی میں نا پید تھی اب مذہبی انتہاپسندی کا مرکز بن چکا ہے۔ ایک پاکستانی صحافی نے حال ہی میں لکھا۔'' بلوچستان واضح طور پر سیکورٹی اور حکمرانی کے پیش نظر ایک ایک ایسا علاقہ بن چکا ہے جہاں متعدد سیاسی، معاشی اور جرائم پیشہ عناصر کے مفادات ایک دوسرے سے ملتے یا متصادم ہوتے ہیں۔''[4]

پاکستان بھر میں بلوچوں کے لئے ہمدردیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ چند ''ہمدردوں'' کے خیال میں پاکستان فوج قومی یکجہتی اور استحکام کے راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ان کے خیال میں بلوچ قو پرستی کی وجہ صوبے کا نا ختم ہونے والا معاشی استحصال اور صوبوں کے درمیان غیر مساوی رویہ ہے اور فوج کی طرف سے قوت کے بے جا استعمال اور بےپناہ انسانی حقوق کی پامالی کی وجہ سے حالات بدتر ہوگئے ہیں۔

[4] ۴۔ امتیاز گل، ''دا ڈائینامک کرائسس'' دا نیوز تیرہ جولائی ۲۰۱۲

بحران کو مزید بگڑنے سے بچانے کے لئے لازمی ہے کہ فوج کے خلاف جو جذبات پائے جاتے ہیں ان کوبلوچ قوم پرستوں کے ساتھ مصالحت میں تبدیل کیا جائے اور ایک ایساعام سیاسی ماحول پیدا کیا جائے جس سے یہ بات ممکن ہو سکے کہ نام نہاد قوم پرست جماعتیں انتخابات میں حصہ لیں۔

بلوچ قوم پرستی کے رخ

تاریخی حوالے سے بلوچ قو م پرست تحریک کا تعلق پاکستان کے اندر بلوچ قومی سوال سے ہے۔ سیاسی اعتبار سے اس میں ہر قسم کے مطالبات شامل رہی ہیں جس میں پاکستان سے آزادی کے مطالبے سے لے کروفاقِ پاکستان کے اندر رہ کر خود مختاری کے مطالبات شامل ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف قوم پرست جماعتوں اور تنظیموں کے موقف میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اگر اس طرح سے دیکھا جائے تو خود '' بلوچ قوم پرستی'' کی اصلاح گمراہ کن ہے۔ سماجی حوالے سے یہ پاکستان اور بلوچستان کے معاشرے میں آنے والی ارتقائی تبدیلی کی عکاسی کرتی ہے۔

ان میں سے ہر پہلو بلاشبہ ایک انتھک سیاسی جد وجہد کا نتیجہ ہے۔ ایک عرصہ تک تو پاکستانی حکومتوں نے بلوچ قوم (پرستی) کے وجود سے انکار کیا جب کہ فوجی حکومتوں نے باضابطہ طور پرایسی پالیسیاں اپنائیں جس سے ''قوم پرست''جماعتیں سخت موقف اختیار کرنے والی تنظیم بن گئیں۔ پاکستان کی وفاقی حکومت کے لئے آسان مگر غلط طریقہ رہا ہے کہ وہ بلوچ قوم پرستی کوچند جاگیراروں کے ردِ عمل کا نتیجہ قرار دے کر اس کی وجود اور مقبولیت سے انکار کرے۔

<u>کردار</u>

بلوچ قوم پرست منظر نامہ پر جو تنظیم موجود ہیں وہ بلوچ قومی تحریک کے تاریخی، سیاسی، سماجی ارتقا کی منظر کشی کرتی ہیں اور اس سے قوم پرست تحریک کے مختلف مقاصد اور متصادم حکمت عملیاں واضح ہوتی ہیں۔ بیشتر تنظیم آزادی کے حق میں ہیں اگرچہ بہت سارے بلوچوں کا جھکاو اس مطالبے سے ہٹ گیا ہے۔

۱۔ بلوچ لبریشن آرمی (بی ایل اے) ایک خفیہ تنظیم ہے جس کا تعلق مری قبیلے سے جوڑا جاتا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ سال دوہزار سات میں اپنی ہلاکت تک بالاچ مری بی ایل اے کی قیادت کرتے رہے۔ ان کے بھائی حیربیار مری کو اس وقت مذکورہ تنظیم کا سربراہ تصور کیا جاتا ہے۔ بی ایل اے'' گریٹر بلوچستان'' کی آزادی کا مطالبہ کرتی ہے جس میں ایران اور افغانستان کے بلوچ علاقے بھی شامل ہیں۔بی ایل اے کے جنگجووں کی تعداد غالباً تین ہزارہے جس میں بیشتر قبائلی افراد ہیں۔[5]

۲۔ اگست دوہزار چھ میں اپنے داد کی ہلاکت کے بعد براہمداغ بگٹی بلوچ ریپبلکن پارٹی (بی آر پی) کی قیادت کررہے ہیں۔ وہ آج کل سوئٹزرلینڈ میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ تنظیم گریٹر

[5] ۵۔ مائیکل براون، محمد داود، ارش ارانلیٹب اور محمود نقوی، '' لسانی فسادات: بلوچستان کا مقدمہ ۔ اکیس جون دوہزار بارہ

بلوچستان کی آزادی کا مطالبہ کرتی ہے اور ہر طرح کی سیاسی مذاکرات کے خلاف ہے۔ بی آر پی کا مطالبہ ہے کہ عالمی برادری مداخلت کرکے بلوچستان میں'' نسل کشی'' روک دے۔

۳۔ بلوچ ریپبلکن آرمی کے بارے میں باور کیا جاتا ہے کہ یہ بلوچ ریپبلکن پارٹی کا مسلح بازو ہے۔ اس کا تعلق عموماً بگٹی قبیلے کے ساتھ جوڑا جاتاہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کی قیادت براہمداغ بگٹی کررہے ہیں۔[6]

۴۔ بلوچ نیشنل موومنٹ گریٹر بلوچستان کا مطالبہ کرتی ہے اور (پاکستانی) سیاسی عمل میں حصہ لینے کے خلاف ہے۔ سال دوہزار نو میں اس کے سربراہ غلام محمد بلوچ مردہ پائے گئے۔ انھوں نے کئی بلوچ گروہوں اور تنظیموں کو ایک پلیٹ فارم پر متحدو منظم کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی موت کے پیچھے فوج ملوث تھی۔ ان کی ہلاکت کی اقوام متحدہ نے بھی مذمت کی۔ [7]

۵۔ نیشنل پارٹی کی قیادت ڈاکٹرعبدالمالک بلوچ کرتے ہیں۔ یہ متوسط طبقے کی ترجمانی کرنے والی وفاق پرست بائیں بازو کی ایک جماعت ہے جس کا ایک معتدل موقف ہے۔ اگرچہ یہ جماعت ماضی میں انتخابی عمل میں حصہ لیتی آرہی ہے لیکن اس نے سال دوہزار آٹھ کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔اس کے کئی رہنما نامعلوم افراد کے ہاتھوں ہلاک کئے گئے ہیں۔[8]

۶۔ سردار اختر مینگل کی زیر قیادت بلوچستان نیشنل پارٹی ایک بڑی قوم پرست جماعت ہے جو سال دوہزار دو سے پہلے حکومت میں تھی لیکن اس نے سال دوہزار آٹھ کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔بی این پی بھی ایک معتدل موقف رکھنے وال جماعت سمجھی جاتی ہے جس کا مطالبہ ہے کہ بلوچستان کو اس کے وسائل کے مد میں زیادہ ریونیو ملنا چائیے۔ ماضی قریب تک بی این پی صرف صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کرتی رہی ہے اور کہتی ہے کہ وفاق کا صوبے پر محددو حد تک قبضہ ہواور وفاق کو صرف امورِ خارجہ اور کرنسی اپنے پاس رکھنے چائیں۔ اس جماعت کے رہنما (سرکاری) اہلکاروں نے ہلاک کئے ہیں اور اب اس کا مطالبہ ہے کہ صوبہ میں حق خودارادیت کے لئے ریفرنڈم کا انعقاد کیا جانا چائیے۔

۷۔بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا قیام انیس سو ساٹھ کی دہائی میں عمل میں آیا اور اس نے کئ قوم پرست رہنماپیدا کئے اور ان کی تربیت کی۔ یہ متوسط طبقے کے لئے قوم پرستانہ سیاست میں حصہ لینے کے لئے اولین پلیٹ فارم ہے۔ اس کے کئی دھڑے ہیں جو بی ایل اے، بلوچ نیشنل موومنٹ ، نیشنل پارٹی اور بلوچستان نیشنل پارٹی کی حمایت کرتے ہیں۔ اس سے اس تنظیم کی آزاد پالیسی پر کوئی اثر نہیں پڑا ہےجس کا اندازہ اس کی ان تحاریک سے لگایا جاسکتا ہے جن کا مقصد پاکستان کو ایک کثیر القومی ملک بنانا یا بلو چ قومی بیداری کو از سرنو زندہ کرنارہا ہے۔ اس وقت سخت گیر موقف رکھنے والی بی ایس او آزادتمام دھڑوں پر غالب ہے اوریہ بی ایل اے سے جڑی ہوئی ہے۔

---

[6] ایضاً
[7] ایضاً
[8] ایضاً

تحریک کا آغاز

بلوچ قوم پرستوں کے مطابق جس قوم پرست تحریک نے ان گروہوں کا جنم دیا ہے اس کی دو ہزار سالوں پر محیط تاریخ میں وسیع اور گہری جڑی یں ہیں۔ کچھ مورخیں کہتے ہیں کہ بلوچ قوم پرست تحریک کا آغاز انیسویں صدی میں برطانوی سامراج کے خلاف ہونے والی جدوجہد کے ساتھ ہی ہوا جب قلات کی ریاست جدید بلوچستان پر مشتمل تھی۔ روس اور برطانیہ کے درمیان جاری کشیدگی کے نتیجے میں برطانیہ نے پہلی بار افغانستان پر حملہ کردیا اوراس کے نتیجے میں برطانوی فورسز بلوچستان آگئے تا کہ یہاں سے کابل جانے والے سپلائی کے راستے بند کئے جائیں[9]۔ تاہم سامراج نے احتیاط سے کام لیا اور ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کی اور صرف افغان سرحد پر قائم زمین کے ایک چھوٹے حصے پر براہ راست اپنی گرفت مضبوط کرلی۔

باقی مورخیں کے خیال میں بلوچ قوم پرست تحریک قیام پاکستان کے وقت عیاں ہوئی۔ برطانوی راج کے جانے کے آخری دہائی میں بلوچ قوم پرستوں نے جو کہ انقلاب روس اور گاندھی و نہرو کی قیادت میں ہندوستان کی تحریکِ آزادی سے متاثر ہوئے تھے بلوچستان کی آزادی کی تحریک شروع کی۔ قیام پاکستان کے ایک روز بعد، پندرہ اگست انیس سو سینتالیس کو خان آف قلات نے اپنی ریاست کی آزادی کا اعلان کیا اگرچہ اس وقت تک وہ پاکستان کے ساتھ دفاع اور امورخارجہ کی حد تک مذاکرات کرنے کو تیار تھے۔ پاکستانی قیادت نےقلات کی آزادی کے اعلان کو مستر د کردیااور نو ماہ بعد بزور جبر قلات کا پاکستان کے ساتھ الحاق کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۸، ۱۹۵۸ اور ۱۹۶۲ میں پاکستان اور بلوچ قوم پرستوں کے درمیان مختلف شدت کے ساتھ جنگیں ہوتی رئیں۔[10]

بلوچ مزحمتی تحریک آزادی کی مارکس اسٹ اور لینن اسٹ تحاریک سے متاثر رہی ہے اور اس کا مقصد مقامی آبادی اور اس کے مفادات کو تحفظ دینا رہا ہے ۔ یہ تحریک ۱۹۶۲ میں مختصر جھڑپوں کے بعد ابھر کر سامنے آئی۔ چند سو نظریاتی افراد شیر محمد مری اورسخت گیر تنظیم بلوچ پیپلز لبریشن فرنٹ کے سائے تلے اکھٹے ہوئے اور بعد میں یہ ڈھانچہ ۱۹۷۳ کی بغاوت میں بھی کام آیا۔ اگرچہ اس ڈھانچہ پر ایک مری قبائلی شخص کا اثر تھا لیکن اس کا اثر مری قبائلی علاقے سے نکل کر اور علاقوں تک پھیل گیا۔ جولائی ۱۹۶۳ تک وسطی بلوچستان کے مینگل قبائلی علاقوں سے لے کر مری قبائلی علاقوں اور صوبے کے شمال مغرب میں ۲۲ قوم پرست (مزحمتی) کیمپ قائم ہوچکے تھے۔ ان کارروائیوں کو چلانے کے لئے چار سو کے قریب نوجوان بطور رضاکار کام کررہے تھے۔[11]

آزادی کا مطالبہ بلوچ پیپلز لبریشن فرنٹ کا نہیں تھا بلکہ یہ مطالبہ بعد میں سامنے آیا جب انیس سو تہتر سے انیس سو ستتر کے دوران بلوچ (پاکستان سے) بدظن ہوتے گئے اور ان کا موقف سخت گیر ہوتا گیا ۔ اگرچہ صدراور بعد میں وزیر اعظم بننے والے ذولفقار علی بھٹو نے پاکستان کو جمہوری آئین دیا

---

[9] تاج محمد بر سیگ '' بلوچ قوم پرستی اس کی ابتدا و ترقی'' کراچی بک کمپنی ۲۰۰۳

[10] سلیگ ہیرسن '' ان افغانستان شیڈو: بلوچ نیشنلزم اینڈ افغان ٹمپٹیشنز (کارنیگی اینڈومنٹ فار انٹرنیشنل پیس، واشنگٹن ڈی سی)

[11] ایضاً

لیکن اس نے خود ان روایات کا احترام نہیں کیا جن کے قیام کے لئے انھوں نے کوشش کی تھی۔ انیس سو تہتر کو انھوں نے نیشنل عوامی پارٹی کی صوبائی حکومت برطرف کردی اور اس کے اہم رہنماوں پر یہ الزام عائد کردیا کہ وہ ریاست کو نقصان پہنچانے کی کوشش کررہے تھے۔ بلوچ تحریک کے جو سخت گیر کارکن تھے ان سب نے مری اور مینگل کی جانب سے شروع کردہ گوریلا تحریک میں شمولیت اختیارکی۔ پاکستان فوج نے اس بغاوت کو کچلنے کے لئے اسی ہزارفوجی تعینات کئے لیکن اس کے باوجود وہ اس تحریک کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ جب جنرل محمد ضیا الحق نے ایک فوجی بغاوت کے نتیجے میں اقتدار سنبھالا تو انھوں نے مذاکرات کا آغاز کیاجس کے نتیجے میں فوج بتدریج بلوچستان سے نکل گئی اور کئ ہزار بلوچ رہنما اور کارکن رہا کئے گئے۔اس کے بعد سال دوہزار پانچ تک صوبہ پر امن رہا۔[12]

<u>قبائل اور متوسط طبقہ</u>

بلوچ قوم پرست تحریک آج جس صورت میں موجود ہے وہ متوسط طبقے سےتعلق رکھنے والے ان بلوچوں کی آزادی کا نتیجہ ہے جنھوں نے بلوچستان سے باہر تعلیم حاصل کی ہے اور یہ سب ایک کٹھن مرحلے سے گزرنے کے بعد ممکن ہوسکا ہے۔ متوسط طبقے کی قوم پرست تحریک اسی وقت ابھری جب فوجی کارروائیوں کی وجہ سے قبائلی شناخت کمزور ہورہی تھی۔ بلوچ قوم پرستی دیگر شعبہ جات تک پھیلنے سے قبل قبائلی ڈھانچے کے اندر ہی پروان چڑھتی گئی۔

بلوچ قوم پرست تحریک کی قبائلی ساخت انترپولوجی اور عمرانیات کے ساتھ ساتھ سیاسیات کے شعبے کے لئے ایک سوال ہے۔ بلوچستان اٹھارہ کے قریب قبائل اور طائفوں میں تقسیم ہے۔ ان قبائل میں سے مری اور بگٹی سیاسی حوالے سے سب سے اہم ترین ہیں اور تاریخی حوالے سے دیکھا جائے تو ان کی فوج کے ساتھ سب سے زیادہ محاذ آرائیاں ہوتی رہی ہیں۔ جب بھی بلوچ قوم پرستی پر بات ہوتی ہے تو بلوچ قبائلی نظام زیربحث آتا ہے۔ جو لوگ بلوچ قوم پرستی کی نفی کرتے ہیں وہ بلوچ قبائلی نظام، اس کے اختیارات، قبائل کی آپسی رنجشوں اورروابط کا حوالہ دیتے ہیں۔

مثال کے طور پرنیپ کا حوالہ دیتے ہوئے فیروز احمد نے ۱۹۹۹ میں لکھا کہ عوامی لیگ کے برعکس جس نے تمام سماجی طبقات کا بالائے طاق رکھا،نیپ بلوچ اور براہوئی قبائل کا محض ایک مجموعہ ہے۔ لسانی حوالے سے بلوچوں اور براہوئیونمیں اتنی بات قدرے مشترک ہے جتنی تاملوں اور پشتونوں میں۔ سچ تو یہ ہے کہ بلوچی بولنے والے تیس میں سے صرف چار اضلاع یعنی خاران، مکران، سبی اور چاغی میں اکثریت میں ہیں۔ خود قلات میں جہاں سے بلوچ قوم پرستی کا آغاز ہوا اکثریت کی زبان براہوئی ہے۔ ان اختلافات کی بنیاد پر پاکستانی دانشور بلوچ قوم پرستی کے بنیادی وجود کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔[13]

---

[12] فیروز احمد، '' پاکستان میں لسانیت اور سیاست''(آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس ۱۹۹۹)

[13] اعجاز احمد '' بلوچستان میں قومی سوال''۔ علاقائی عدم توازن اور پاکستان میں قومی سوال'' ایڈیٹر اکبر زیدی (وین گارڑ، لاہور ۱۹۹۲)

ماضی قریب میں پاکستان کے صدر اورفوج کے سربراہ جنرل پرویز مشرف نے بلوچستان میں اپنی جارحیانہ کارروائیوں کا یہ جواز پیش کیا کہ وہ ایک مہم کے تحت صوبے کے ان اقلیتی قبائلی سرداروں کے ظلم و ستم کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں جو مبینہ طور پر صوبے کی پس ماندگی کے ذمہ دار تھے۔ یہ قبائلی سردار آسانی سے فوجی حکومت کے ہاتھوں قربا نی کا بکرا بن گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حکومت نے دعویٰ کیا کہ صوبے کے صرف سات فیصد علاقوں میں مزحمت کار مصروف عمل تھے لیکن حکومت نے کبھی یہ بات واضح نہیں کی کہ باقی ماندہ ترانوے فیصد علاقہ جس پر حکومت کا قبضہ تھا کیوں کر پس ماندہ تھا۔

بلوچستان میں اٹھائیس صاحب حیثیت قبائلی سرداروں میں سے صرف تین نے واضح طور پر وفاق حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی۔ بلوچ صحافی ملک سراج اکبر کا کہنا ہے کہ بلوچ لبریشن آرمی کسی ایک سردار کی ملکیت نہیں ہے۔ مری، مینگل، بگٹی قبائل سے تعلق رکھنے والا کوئی قوم پرست رہنما بلوچ لبریشن آرمی کی سربراہی کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا حالاں کہ سب اس کی کارروائیوں کی حمایت کرنے کا اعتراف کرتے ہیں۔ بلوچ تحریک کے شروع کے رہنماوں بالاچ مری اور اکبر بگٹی کی ہلاکت کے باوجود بلوچستان اور مرکز کے درمیان ہونے والے تنازعہ کا خاتمہ نہیں ہوسکا۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ بلوچستان اور پاکستان کی وفاقی حکومت کے درمیان ہونے والے ہر نئے تنازعہ کے نتیجے میں بلوچ قبائلی ڈھانچہ کمزور تر ہوتا گیا۔ قبائلی نظام مکمل طور پر منظر نامے سے غائب نہیں ہوالیکن اس نے اپنی مرکزی حثیت کھو دی۔

آج بلوچ تحریک کی قیادت متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والےپڑھے لکھے لوگ کررہے ہیں۔ مری بگٹی کو چھوڑ کر تحریک کے مشہور ترین رہنماوں کا تعلق متوسط طبقے ہی سے ہے۔اس(متوسط) طبقے کی پاکستانی فوج، انتظامیہ اور اعلیٰ عہدوں پر نمائندگی نہیں ہے اور یوں پڑھے لکھے بلوچوں کی بڑی تعداد قوم پرست تحریک میں شامل ہوگئی ہے۔[14] متوسط طبقہ قومی اتحاد میں بھی کلیدی کردار ادا کرتا ہے کیوں کہ یہ طبقہ قبائلی رہنماوں اور اسلام آباد کے درمیان ہونے والے انفرادی یا اجتماعی معاہدوں کی مخالفت کرتا ہے اوراسے پتہ ہے کہ ان (اسلام آباد اور قبائلی سرداروں) کے درمیان پائی جانے والی ناچاقیوں سے کیسے فائدہ اٹھایا جائے۔

اس تبدیلی کے نتیجے میں تحریک کا جغرافیہ بھی تبدیل ہوگیا ہے اور اب اس کا رخ دیہی علاقوں سے شہری علاقوں اور صوبے کے شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف بدل گیا ہے۔ کبھی کبھار اس کے اثرات کراچی میں بھی محسوس کئے جاتے ہیں۔ تحریک میں جو عمرانی تبدیلی آئی ہے اس کا کسی حد تک تعلق تحریک کے تاریخی ارتقا سے ہےجب کہ دوسری طرف اس کا تعلق صوبے کے بدامنی کے بد ترین شکار علاقوں ڈیر بگٹی اور کوہلو کے علاوہ ان علاقوں کی شمولیت بھی ہے جہاں قبائلی نظام سرے سےموجود ہی نہیں ۔

[14] مہوش احمد '' بلوچستان کے متوسط طبقے کی بغاوت'' (ڈان، پانچ جون۲۰۱۲)

زیادہ تر نئے بلوچ رہنماوں کو تعلق شہری علاقوں مثلا کیچ، پنجگور، گوادر (اور کسی حد تک کوئٹہ، خضدار، تربت، خاران اور لسبیلہ) سے ہے۔[15] وہ کراچی اور خلیجی ممالک سے اچھے طریقے سے منسلک ہیں جہاں قبائلی نظام موجود نہیں ہے۔ اگرچہ تشدد تو پورے صوبے میں ہے لیکن مزحمتی تحریک کا مرکز یہ دیہی علاقے ہیں۔

نیم فوجی دستہ فرنٹئیرکور جس کا کام پاکستان کے سرحدی علاقوں کی نگرانی کرنا ہوتا ہے نے بظاہر جنوب مغربی بلوچستان میں پنجگور، تربت اور گوادر کے علاقوں میں پچاس ہزار نفری تعینات کی ہے۔

یوں آج بلوچستان کا متوسط طبقہ پاکستان فوج اور نیم فوجی دستوں کا سب سے بڑا نشانہ بن گیا ہے جس کا مقصد بلوچستان سے بلوچ قوم پرستی کے تمام آثارو عزائم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جڑ سے اکھاڑنا ہے تاکہ یہ تحریک پھر سر نہ اٹھاسکے۔[16]لیکن وفاق کی اس حکمت عملی سے خود صوبے کا مستقبل خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ بیشتر لوگ جو اس تحریک کا حصہ ہیں ان کا تعلق متوسط طبقے سے ہے اوربتایا جاتا ہے کہ ان کی عمر تیس سال سے کم ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ پاکستان کی حکمت عملی کے نتیجےمیں قوم پرست تحریک میں شامل تمام معتدل قوتوں نے بھی اب سخت گیر موقف اختیار کیا ہوا ہے۔ کم از کم لفاظی کی حد تک تمام سیاسی جماعتوں نے اپنا موقف سخت کیا ہے کیوں کہ بصورت دیگر وہ اپنے حلقوں میں عوامی حمایت کھوبیھٹیں گی۔ سال دوہزار چھ میں نیپ کے رہنما اور بلوچستان نیشنل پارٹی کے سرخیل عطا اللہ مینگل نے کہا تھا کہ'' اب سیاسی جنگیں لڑنے کا وقت گزر گیا ہے۔''[17]

بلوچستان میں تضادات کی سیاست

جب تک پاکستان کی مرکزی حکومت نےقوم پرستوں کی نمائندگی تسلیم کی اس وقت تک ان کی قیادت سمجھوتہ کرنے پر تیار رہی۔ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ فوجی حکومت قوم پرست قیادت کو جڑ سے اکھاڑنے کے درپے ہے تو اس طرح کے سمجھوتے نا پید ہوگئے یا بہت کم نظر آنے لگے۔

انتخابی دھاندلی اور مشرف کی اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی کی پالیسی

اینس سو نوئے کی دھائی میں مختلف اداروں میں زبردست نمائندگی کی وجہ سے لسانی کشیدگی بڑی حد تک ختم ہوگئی تھی۔ قوم پرست جماعتیں مضبوط قوت کی صورت میں ابھریں۔۱۹۸۸ کے عام انتخابات میں قوم پرست ووٹ کا تناسب ۴۷.۸رہا۔ ۱۹۹۰ میں یہ تناسب ۵۱.۷۴اور ۱۹۹۰ کے عام انتخابات میں یہ تناسب ۵۱.۷۴رہا۔ ۱۹۹۷ میں ہونے والے انتخابات میں بھی بلوچ قوم پرست جماعت

---

[15] ایضاً

[16] ساسوئی عباس لغاری، '' بلوچستان کرائسس''، دا نیوز انٹرنیشنل، اگست ۲۵، ۲۰۱۲

[17] ملک سراج اکبر'' مینگل: سیاسی جنگیں لڑنے کا وقت گزرگیا ہے'' بائیس نومبر ۲۰۰۶ http://gmcmissing.wordpress.com/2006/11/22/%E2%80%9C-the-days-to-fight-political-battles-ore-over%E2%80%A6%E2%80%9D-mengal

غالب رئیں اور انھوں نے صوبائی حکومت تشکیل دی۔[18] بلوچ رہنماوں کی ملک کی بڑی جماعتوں پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ نواز میں بھی نمائندگی تھی۔ اگرچہ وقتا فوقتاً بلوچستان اور سول وفاقی حکومت کے درمیان تعلقات کشیدہ ہوتے رہے لیکن اس تمام عرصے میں صوبہ پرامن رہا۔

سال دوہزار دوکے انتخابات میں اختیارات کا یہ توازن اس وقت بگڑ کیا جب فوج نے دھندلی کرکے اپنے دیرینہ حلیف یعنی ملاوں کے اتحاد متحدہ مجلس عمل کی معاونت کی تا کہ وہ بلوچستان میں اقتدار میں آئے۔ یورپی یونین کے انتخابی مبصرین نے اپنی رپورٹ میں بتا یا کہ بلوچستان میں انتخابات سے پہلے، انتخابات کے دوران اور انتخابات کے بعد دھاندلی ہوئی تھی۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان پر یہ الزام بھی لگاکہ اس نے ان جماعتوں کے حلقوں میں مداخلت کی جو فوجی حکومت کے خلاف تھے اور حکومت نواز عناصر کی حمایت کی۔ امیدواروں کی اہلیت کے لئے یونی ورسٹی ڈگری کی ضرورت کے پیمانے میں تبدیلی لائی گئی اور مدارس کی جاری کردہ اسناد کو قابل قبول قرار دیا گیا۔[19]اکبر بگٹی سمیت کئ سرکردہ قوم پرست رہنماوں کویونی ورسٹی ڈگری نہ ہونے کی وجہ سے انتخابات سے روک دیا گیا حالاں کہ ان میں سے بیشتر افراد ماضی میں اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہ چکےتھے۔ یوں ان کی غیر حاضری سے ایم ایم اے کو بے حد فائدہ پہنچا۔

انتخابی نتائج کو اپنے حق میں تبدیل کرنے کے پس منظر میں اسلام آباد کے دیگر اسٹریٹجک مقاصد تھے۔ افغانستان سے ملحقہ دو صوبوں میں اسلامی جماعتوں کے اقتدار میں آنے سے اسلام آباد کے لئے آسان ہوگیا کہ وہ افغانستان کی جنگ میں شامل عناصر کوپاکستان میں پناہ فراہم کریں تاکہ وہ مزحمتی جنگ لڑسکیں اور اس کے ساتھ ساتھ بیک وقت ان کے پاکستان میں موجود ہونے سے بھی انکار کرے۔

بلوچ اور پشتون قوم پرستوں کو احساس ہوا کہ وہ انتخابات کے ان نتائج سے متاثر ہوگئے تھے۔ ایک بلوچ، جام محمد یوسف، کو بطور وزیراعلیٰ مقرر کیا گیا لیکن ان کا اپنے ہی کابینہ پر محدود اختیار تھا اور ان کی کابینہ پر تنگ نظر اسلامی جماعت جمعیت علمائے اسلام کا غلبہ رہا۔ جب بلوچوں کو محسوس ہواکہ اپنے ہی صوبےمیں ان کی شنوائی نہیں ہورہی تھی توانھوں نے فوجی انتخابات، سیاست اور آئینی استحصال کو مسترد کردیا۔ سال دوہزار دو میں ہونے والے انتخابی دھاندلی نے مسئلہ بلوچستان کے پہلے خشت کی بنیاد ڈال دی۔[20]

مشرف اس بات پر بضد تھا کہ وہ بلوچ قوم پرستی کو جڑ سے اکھاڑ دے گا۔ انھوں نے کشیدگی شروع ہونے سے پہلےہی بلوچ رہنماوں کی گرفتاری کا سلسلہ شروع کردیا۔ ستمبر دو ہزار چار میں ایک پارلیمانی کمیٹی جس میں حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والے بلوچ رہنما شامل تھے نے یہ سفارش کی کہ مسائل کا حل گفت شنید سے ڈھونڈا جائے لیکن حالات بدستور بگڑتے گئے۔ ایک ایسے وقت میں

---

[18] انٹرنیشنل کرائسس گروپ رپورٹ ''پاکستان کا بگڑتا ہوا بلوچستان تنازعہ'' ستمبر ۲۰۰۶

[19] یورپی یونین کی حتمی رپورٹ برائےپاکستانی انتخابات۔ تاریخ اجرا: دس اکتوبر ۲۰۱۲
Final Report of the EU Election Observation Mission to Pakistan: National and Provincial Assembly Elections,

[20] انٹرنیشنل کرائسس گروپ رپورٹ ''پاکستان کا بگڑتا ہوا بلوچستان تنازعہ'' ستمبر ۲۰۰۶

جب اکبر بگٹی کے ساتھ سمجھوتہ ہونے والا تھا مشرف نے جان بوجھ کر محاذ آرائی کے راستے کو ترجیحی دی۔

جنرل مشرف نے بلوچستان کے مسئلے سے نمٹنے کے لئے اقتدارکی نچلی سطح پر منتقلی کا ایک نیا نظام متعارف کرایا تاکہ مقامی حکومتیں صوبائی اسمبلیوں کو نظر انداز کرکے اپنی بقا کے لئے مکمل طور پر وفاقی حکومت پر انحصار کریں ۔اگرچہ حکومت نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اس نظام کا مقصد اختیارا ت کی نچلی سطح پر منتقلی ہے لیکن پنجاب کے علاوہ باقی تمام صوبوں نے اس نظام کو صوبائی خود مختاری کی نفی قرار دیتے ہوئےیہ تاثر لیا کہ وفاقی حکومت نے ان پر یہ نظام جبراً مسلط کیا ہوا ہے۔ بلوچ قوم پرستوں کے لئے یہ نظام واضح طور پر ناراضگی کا با عث رہا۔

ڈیرہ بگٹی جو تنازعہ کا مرکز تھا میں فوج نے مداخلت کی اور یوں علاقے کی بڑی آبادی بے گھر ہوگئی۔خفیہ اداروں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی طرف سے ماروائے عدالت ہلاکتیں، ٹارچر، اور غیر قانونی ہلاکتیں عام ہوگئیں۔ سال دوہزار چھ میں پاکستانی ذرائع ابلاغ نے ایک نئے مسئلے یعنی جبری گمشدگیوں کی رپورٹنگ شروع کی۔

پاکستان فوج نے اکبر بگٹی کو ہلاک کیااور جنرل پرویز مشرف نے ان کی ہلاکت کو فیصلہ کن کامیابی قرار دیا لیکن اس سے صرف تنازعہ مزید بگڑگیا۔

سویلین اختیارات کا سراب

بلوچستان میں جنرل مشرف کے بعد کا دور سال دوہزار آٹھ میں ان کی صدارت کے باقاعدہ خاتمے سے پہلے ہی شروع ہوگیا۔ نئے حالات میں فوجی طاقت کے استعمال کے مقابلے میں سیاسی طرائق زیر استعمال نہیں لائے گئے اور افہام و تفہم کے سامنے سیکورٹی فورسز کی موجودگی غالب رہی۔

نواب بگٹی کی ہلاکت کے پیش نظر قوم پرستوں نے سال دوہزار آٹھ کے انتخابات کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا جس سے بڑے پیمانے پر دھاندلی کے دروازے کھل گئے۔جب ستمبر دوہزار گیارہ میں الیکشن کمیشن آف پاکستان نے انتخابی فہرستوں کی جانچ پڑتال کی تو پتہ چلا کہ بلوچستان میں دوہزار آٹھ کے انتخابات میں ۶۵ فیصد ووٹ جعلی پڑے تھے۔ جلد ہی سیکورٹی اسٹبلشمنٹ کے قریب رہنے والی وہ تمام جماعتیں جن کی ملک کے دیگر حصوں میں ایک دوسرے کے ساتھ نہیں بن پارہی تھی یکدم ایک دوسرے کے اتحادی بن گئیں اور صوبے میں ایک ایسی حکومت قائم کی گئی جس میں حزب اختلاف برائے نام رہی اور صوبائی حکومت سے کبھی پوچھ گچھ نہیں ہوئی کہ وہ سرکاری پیسہ کیسے خرچ کررہی تھی۔ صوبائی اسمبلی میں ایک رکن کو چھوڑ کر باقی تمام اراکین کو وزارتیں سونپ دی گئیں جس سے بد عنوانی کے غیر معمولی دروازے کھل گئے اورصوبے میں جاری سیاسی بحران کے خاتمے کے لئے وفاقی حکومت کی جو کوششیں تھیں انھیں دھچکا لگا۔[21]

[21] دا فریس ان بلوچستان، پاک میڈیا، فروری ۸، ۲۰۱۳

وفاقی حکومت نے مزید کوششیں کیں کہ خطے میں کشیدگی کم کی جائے۔ فروری دوہزار آٹھ میں منعقد ہونے والے عام انتخابات کے فوری بعد پاکستان پیپلز پارٹی نے ریاست پاکستان کی جانب سے بلوچستان میں کئے گئے زیادتیوں پر معافی مانگی۔سال کے آخر میں نو منتخب صدر آصف علی زرداری نے اس بات پر زوردیا کہ بلوچستان کے ماضی کے زخموں پر مرہم رکھا جائے اور وفاق پر (صوبہ کا) اعتماد بحال کیا جائے۔

آخر کار اکتوبر دوہزار نو میں شہید بینظیر بھٹو مفاہمتی کمیٹی برائے بلوچستان نےاپنی رپورٹ پیش کی جس کے تحت بلوچ قوم پرستوں کے ساتھ مصالحت، صوبائی اداروں کی تعمیرِ نواور وسائل کی تقسیم کے نئے فارمولےپر زور دیا گیا۔[22]

نومبر دوہزار نو کے شروع میں حکومت نے صوبے کو زیادہ خود مختاری دینے کا وعدہ کیا۔ چوبیس اکتوبر کو حکومت نے بلوچستان کو مزید خود مختاری دینے سے متعلق انتالیس صفحات پر مشتمل بل یعنی''بلوچستان پیکیج'' پارلیمان میں پیش کیا۔بل کے متن میں سیاسی جلاوطن ہونے والے رہنماوں کی واپسی،جیل ہونے والے سیاسی کارکناں کی رہائی، اہم علاقوں سے فوج کے انخلا اورقومی وسائل کی تقسیم کے فارمولے کی اصلاح، روزگار کےمواقع پیدا کرنےاور صوبے کے وسائل پر بلوچستان کے زیادہ کنٹرول کی سفارش کی گئی تھی۔ دسمبر دوہزار نو میں پارلیمان نےیہ متن منظور کرلیا۔[23]

بلوچستان پیکج نے بلوچوں کے شروع کے تمام مطالبات تسلیم کئےجس میں متنازعہ مسائل مثلاً سیاسی کارکناں کی رہائی، جلاوطن رہنماوں کی واپسی،لاپتہ افراد کے معاملے کی تحقیق اورعدالتی تحقیقات اور دیگر امورسے متعلق شقیں بھی شامل کی گئیں۔ اس میں صوبے کے معاشی مسائل سے متعلق شقیں شامل تھیں۔ اس کے تحت وعدہ کیا گیا کہ صوبے کو اضافی فنڈز فراہم کئے جائیں گے اورروزگار کے سولہ ہزار مواقع پیدا کئے جائیں گے۔

چوں کہ قوم پرست زیادہ خود مختاری کی توقع کررہے تھے تو انھوں نےفوری طور پر اس حکومتی منصوبے کو مسترد کردیا۔ [24]حتیٰ کہ جونستباًنرم گیر قوم پرست تھے انھوں نے بھی حکومت کی سفارشات کو بلوچوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف قراردیا اور کہا کہ اس کے پس پردہ حکومت قوم پرستوں کے خاتمے کے لئے اپنے منصوبہ پر کار مند رہے گی۔ دسمبر دوہزار نو تک تمام قوم پرستوں نے باضابطہ طور پر حکومت کی سفارشات کو رد کردیا۔ اب وہ بلوچستان کے لئے حق خود ارادیت کا مطالبہ کرنے لگے۔ بلوچستان پیکج پر کبھی عمل درآمد نہیں ہوا۔

سال دوہزار دس میں بلوچستان کا بجٹ دوگنا کردی گیاا اور فوری طور پر گیس ریونیو کے مد میں واجب الاداایک سو چالیس ملین روپےصوبےکو واپس کردئیے۔[25] ایک صحافی کے مطابق صوبائی

---

[22] بلوچستان میٹرز، ڈان ۲۸ اکتوبر ۲۰۱۳

[23] پیکج کے بارے میں مزید جاننے کے لئے، پاکستان انسٹیٹیوٹ آف لیجسلیٹو ڈویلپمنٹ کی رپورٹ: ''آغازِ حقوق بلوچستان: ایک جائزہ'' دیکھیں، دسمبر دو ہزار نو

[24] ساوتھ ایشین میڈیا نیٹ ورک: '' پاکستان: بلوچ قوم پرست کہتے ہیں کہ یہ نسل کشی کا ایک منصوبہ ہے''،٦ دسمبر دو ہزار نو

[25] ہیومن رائیٹس واچ، '' ہم تشد د اور مارسکتے ہیں اور تمہیں کئی سالوں تک اپنے قبضے میں رکھ سکتے ہیں۔''جولائی ۲۰۱۲

حکومت کے اراکین نے یہ رقم اپنی جیبوں میں ڈال دی اور فضول منصوبوں پر خرچ کی اور یوں اس سے قوم پرستوں کی ناراضگی ختم کرنے میں کوئی مدد نہ مل سکی۔[26]

سچ تو یہ ہے کہ حکومت نے بلوچستان کی معیشت کو بہتر بنانے کی خاطربہت کم اقدامات اٹھائے ہیں۔وفاقی حکومت نے صوبے کے لئے زیادہ پیسے مختص کئے ہیں لیکن لگتا ہے کہ یہ رقم صیح ہدف تک پہنچ نہیں پارہی ہے۔ صنعتیں تباہ ہوگئی ہیں اور چند سال پہلے آنے والے قحط سالی سے نمٹنے کے لئے آبپاشی کےاضافی منصوبے نہیں ہیں۔اساتذہ اور دیگر پیشہ وارانہ افراد صوبہ چھوڑ چکے ہیں جب کہ صحت اور صفائی کی سہولیات پر کوئی توجہ نہیں دی جارہی ہے۔[27]

صوبائی حکومت نے اپنے آپ کو تمام ذمہ داریوں سے بری الذمہ قرارد یا ہے۔ اگست دوہزارباره کو پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے بتایا کہ صوبے میں حکومت '' کہیں بھی نظر نہیں آتی''۔حکومت اپنے کئ اجلاس صوبے کے باہر منعقد کرتی ہے۔ غیر سرکاری اور ترقیاتی ادارے بھی اپنے اسٹاف کو درپیش سیکورٹی خدشات کے پیش نظرصوبے سے نکل رہے ہیں جب کہ سرحد کے دونوں اطراف میں منشیات کا کاروبار اور اغوا برائے تاوان کے واقعات میں بتدریج اضافہ ہورہا ہے۔

صوبے کا سماجی ڈھانچہ باضابطہ طور پر تباہ ہوگیا ہےاوراس کے نتیجے میں صرف سخت گیرعناصر باقی رہ گئے ہیں۔ جنوری دوہزارتیرہ کو نوئے شعیوں کی ہلاکت کے بعد وفاقی حکومت نے شعیوں کے دباومیں آکر وزیر اعلیٰ نواب اسلم رئیسانی کی برطرف کردیا اور صوبے میں گورنر راج نافذ کیا۔ (بلکہ صوبے کو ایک طرح سے فوج کے حوالے کیا گیا کیوں کہ گورنرکو اختیار حاصل تھا کہ وہ صوبے میں امن و امان کی صورت حال سے نمٹنے کے لئے کسی وقت بھی فوج کی مدد طلب کرے)۔[28]

بلوچستان اب ایک اور سیاسی کشیدگی کا شکار ہے۔ سیاسی جماعتوں کی کوشش ہے کہ صوبے سے گورنر راج کا خاتمہ کرایں اور ایک نئی حکومت تشکیل دیں۔ وفاقی حکومت کے ساتھ مذاکرات جاری ہیں لیکن یہ واضح نہیں کہ ایک نئی حکومت قائم ہوگی اور اس کی سربراہی کون کرے گا۔ اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ آیا نئی حکومت صوبے میں جاری تشدد کو روک سکے گی یا نہیں۔

جبربطورِ پالیسی

چند سالوں سے حکومت کے بلوچستان میں جبری پالیسی کے حکمت عملی میں تبدیلی آئی ہے[29]۔ فوجی آپریشن تو رک گئ ہے لیکن صوبے بھر سے لوگ اغوا اور ہلاک ہوئے ہیں۔ کئی لوگوں کی مسخ شدہ لاشیں ملی ہیں جنھیں '' مارو اور پھینک دو'' کی پالیسی کا نام دیا گیا ہے۔ ان کارروائیوں کا مقصدصوبے کو اپنے قابو میں رکھنا اوراس پر ریاست کا تسلط قائم کرنا ہے۔

---

[26] دا فریس ان بلوچستان، پاک میڈیا،۸ فروری، ۲۰۱۳

[27] انسانی حقوق کمیشن آف پاکستان کی ۳۰ اگست ۲۰۱۲ کی رپورٹ '' بلوچستان میں امید، خوف اور ناراضگی''

[28] الجزیرا، ۱۴ جنوری، ۲۰۱۳ :'' شعیہ ہلاکتوں پر بلوچستان میں اہلکار برطرف''

[29] اس سلسلے میں دیکھیں میر محمد علی تالپور کی تحریر'' الجیرز کی جنگِ فتح'' ڈیلی ٹائمز، ۲۵ اپریل ۲۰۱۰

جو افرادبلوچستان میں پاکستان فوج کے ہاتھوں لاپتہ ہوئے ہیں ان کی مخصوص تعداد واضح نہیں ہے۔ بلوچ قوم پرست ''ہزاروں'' کا دعویٰ کرتے ہیں جب کہ سال دوہزار آٹھ میں وزیر داخلہ رحمن ملک نے گیارہ سو اور جنوری دوہزار گیارہ میں بلوچستان کے وزیرداخلہ ظفر اللہ زہری نے کہا تھا کہ صرف پچپن افراد لاپتہ ہیں۔[30]

گیارہ ستمبر دہ ہزار بارہ کو ایکسپریس ٹربیون میں شائع ہونے والے ایک اداریہ میں کہا گیا کہ جنوری دو ہزار گیارہ سے ستاون افراد دکی لاشیں ملی ہیں۔ اگست دوہزار بارہ کو پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق نے کہا کہ جنوری دو ہزار سے لے کر بارہ مئی دوہزار بارہ تک اس نے ایک سو اٹھانوے لاپتہ افراد کے کیسز کی تصدیق کی ہے جن میں سے ستاون کی لاشیں صرف سال دوہزار بارہ میں ملی ہیں۔[31]

پاکستانی ذرائع ابلاغ اور بین الاقوامی تنظیموں نے چند کیسز کے اچھے طریقے سے کوائف جمع کئے ہیں۔ ہیومن رائٹس واچ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی اس بات سے اتفاق کرتی ہے کہ اس بات میں بہت کم شک کی گنجائش ہے کہ جبری گمشدگیوں کے بیشتر واقعات میں پاکستان کے خفیہ ادارے اور فرنٹیر کور ملوث ہیں جو یہ کارروائیاں مقامی پولیس کی مدد سے کرتی ہیں۔[32]

ایک واقعے کی بالخصوص پاکستان اور غیر ملکی سطح پر تشہیر ہوئی ہے[33]۔ تیرہ اپریل دو ہزار نو کو تین سیاسی کارکن بشمول بلوچ نیشنل موومنٹ کے صدر غلام محمد بلوچ کو ان کے وکیل کے دفتر سے عدالت کے احاطے سے تربت میں اغوا کیا گیا۔[34] اغوا اسی روز پیش آیا جب انسداد دہشت گردی کی ایک عدالت نے ان کے خلاف تمام مقدمات ختم کردیئے تھے[35]۔ ان کی لاشیں چھ دن بعد شہر سے چالیس کلومیٹر دور ایک پہاڑی علاقے میں ملیں۔ ان تین کارکناں کی ہلاکت سے ایک نئے سفاکانہ پالیسی کی عکاسی ہوئی اور اس سے مارو اور پھینک دو کی کارروائیوں کا بھی آغاز ہوگیا۔ اس کے بعد ان واقعات میں بدستور اضافہ ہوتا گیا۔

سیاسی کارکناں اور مزحمت کاروں کے علاوہ متاثرین میں وہ لوگ بھی شامل ہوگئے جو شدت پسندوں کے حامی، مشتبہ قوم پرست، طلبہ، اساتذہ، وکلا، صحافی اور دیگر پڑھے لکھے لوگ تھے۔ اس کے نتیجے میں کئی پیشہ وارانہ افراد صوبہ چھوڑ کر پاکستان کے دیگر حصوں میں چلے گئے ہیں اور اس سےبلوچستان کے مستقبل پر مزید سوالات ابھر کر سامنے آئے ہیں۔

اگرچہ فوج اور خفیہ ادارے ان الزامات کی تردید کرتے ہیں لیکن پاکستانی ذرائع ابلاغ کا کہنا ہے کہ بلوچستان میں ایسے ڈیتھ اسکواڈقائم کئے گئے ہیں جو بنگلہ دیش کی جنگ میں پاکستان فوج نے البدر

---

[30] ہیومن رائیٹس واچ، '' ہم تشد د اور مارسکتے ہیں اور تمہیں کئی سالوں تک اپنے قبضے میں رکھ سکتے ہیں۔''جولائی ۲۰۱۲

[31] انسانی حقوق کمیشن آف پاکستان کی ۳۰ اگست ۲۰۱۲ کی رپورٹ '' بلوچستان میں امید، خوف اور ناراضگی ''

[32] [32] ہیومن رائیٹس واچ، '' ہم تشد د اور مارسکتے ہیں اور تمہیں کئی سالوں تک اپنے قبضے میں رکھ سکتے ہیں۔''جولائی ۲۰۱۲

[33] ایضاً

[34] ان کے ساتھ باقی دو کارکن تھے ان میں سے لالہ منیر کا تعلق بلوچ نیشنل موومنٹ اور شیر محمد کا تعلق بلوچ ری پبلکن پارٹی سے تھا۔

[35] سلیم شاہد، روزنامہ ڈان، دس اپریل ۲۰۰۹، '' بلوچستان میں قوم پرست رہنماوں کے قتل کے خلاف ہنگامہ''۔ واضح رہے کہ غلام محمدان مذاکرات میں شامل تھے جن کا مقصد اقوام متحدہ کے ادراہ برائے مہاجرین کے اغوا ہونے ولاے کوئٹہ دفتر کے ڈائریکٹر جان سولیکی کی بازیابی تھی۔

اور الشمس کی صورت میں قائم کی تھیں۔[36] ان تنظیموں میں کرایہ کے بلوچ قاتلوں کو بھرتی کیا گیا ہے۔ خفیہ اداروں نے یہ ڈیتھ اسکواڈ اس لئے قائم کئے ہیں کہ مری، بگٹی اور مینگل کا مقابلہ کیا جائے اور ان کی روز مرہ کی سرگرمیوں میں خلل ڈالا جائے۔ شاید پاکستان قبائلی سربراہان کے مقابلے میں ایک ایسے بلوچ نمائندے کو سامنے لائےجو مکمل طور پر اسلام آباد کا وفادارہو۔ مزحمت کاروں نے بھی جو حربے اختیار کئے ہوئے ہیں وہ بھی ناقابل پسند ہیں کیوں کہ ان حربوں سے وہ بھی لسانی بنیادوں پر قتل و غارت کررہے ہیں۔شروع کے دنوں میں بلوچ لبریشن آرمی نے صرف سیکورٹی فورسز، ریاست اور ایجنسیوں کو پنجاب کی بالادستی کی علامت سمجھ کر نشانہ بنایا لیکن عام پنجابی شہریوں کو نشانہ نہیں بنایا۔

جب مزحمتی تحریک کی سیاسی قیادت کو مٹادیاگیا تو اس کےبعدشدت پسندوں نےعام شہریوں کو بھی نشانہ بنایا۔ خیر بخش مری جیسے سیاسی شخصیات کے غیر ذمہ دارانہ بیانات نے بلوچستان کے سیاسی ماحول کو مزید بگاڑدیا جب انھوں نے کہ میں ''سور کے ساتھ رہ سکتا ہوں لیکن پنجابی کے ساتھ نہیں''۔[37] جولائی دوہزار بارہ کو اخبارات نے تربت کے علاقے میں اٹھارہ لوگوں کے ہلاکت کی خبر دی جن میں سے بیشتر پنجابی تھے۔[38] واقعے کی ذمہ داری بلوچ لبریشن ٹائیگرز نے قبول کی جس کا نام پہلے کبھی نہیں سنا گیا تھا۔

اندرونی اختلافات کی وجہ سے قوم پرست کیمپ خود تقسیم ہوگئی ہے۔ حتیٰ کہ بلوچ شدت پسندوں نے غیر قوم پرست بلوچوں کو بھی قتل کیا ہے۔

لسانی شناخت کا توڑ:بلوچستان میں اسلامائزیشن

[36] محمد اکرم، ''بلوچ رہنماوں نے اپنے مطالبات تو کردئیے ہیں۔ آیا کوئی سن رہا ہے؟'' روزنامہ ڈان، ۲۸ ستمبر ، ۲۰۱۲

[37] ملک سراج اکبر، ''بلوچ قومی تحریرک کے نئےرخ'' صفحہ ۳۱۳،

[38] میر محمد علی تالپور، ''محض ایک رسم'' ۸ جولائی ، ۲۰۱۲۔ اس ضمن میں اسی تاریخ کے ڈان،دا نیوز، ڈیلی ٹائمز، نیشن اور ایکسپریس ٹربیون بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

پاکستان میں فوجی حکومتوں نے لسانی شناخت کے خاتمے کے لئے صوبوں میں آبادی کے تناسب کو بگاڑ دیا ہے یا وہاں مذہبی انتہاپسندی کو پروان چڑھایا ہے تا کہ لسانی شناخت کی جگہ ایک مشترکہ مذہبی شناخت لے لے۔بلوچستان میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ انیس سو اکہتر میں پاکستان نے بلوچوں کو اپنے ہی صوبے میں کمزور کرنے کی خاطر پشتون علاقوں کو بلوچستان سے جوڑا۔ انیس سو ستر کے اواخر میں صوبہ سرحد یا اب خیبر پختونخواہ کے بعد بلوچستان جنرل ضیا الحق کے اسلامائزیشن حکمت عملی کا نشانہ بن گیا۔ تب سے یہ علاقہ مرکزیت کے تمام پالیسوں کا لازمی جز بن گیا ہے۔ بھٹو حکومت کے خاتمے سے لے کر جنرل مشرف کی اقتدار میں آمد تک پاکستان کی بلوچستان پالیسی میں خاطر خواہ تبدیلی دیکھنے میں آئی جن میں سے چند اب بھی عیاں ہیں۔

جنرل ضیا کی مذہبی پالیسی دراصل (بلوچ) مزحمت کے خلاف ایک ہتھیار تھی۔ جنرل ضیا نے سرکاری طور پرپاکستان کے لئے ایک ایسا سیاسی نظام تجویز کیا جو کہ اسلام سے مطابقت رکھتا ہو۔ فوجی آمر نے اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نو کی جو کہ ایک ایسا مشاورتی ادارہ تھا جس کا واحدمقصدایک اسلامی نظام حکومت تشکیل دینا تھا[39]۔اس نے حدود قوانین متعارف کرائے جن کے تحت زنا، جنسی زیادتی اور چوری کے حوالے سےنئی سزائیں تجویز کی گئیں۔انھوں نے شرعی عدالتیں قائم کیں جن کا مقصد اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ تمام قوانین اسلام کے عین مطابق تھے۔ انیس سو چھیاسی میں ناموسِ رسالت کا ایک قانون متعارف کیا گیا۔ بلوچستان اور پاکستان کے دیگر دیہی علاقوں میں اسلامائزیشن کے ساتھ ہی مذہبی علما کی آمد، مدارس کا قیام اور اسکولوں کے نصاب کو اسلام کے مطابق ہم آہنگ کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

یہ پالیسیاں قطعا نئی نہیں تھیں۔ اس سے قبل فوجی آمروں ایوب خان اور یحیٰ خان نے بھی اپنی حکومتوں کو قانونی طور پر جائز ثابت کرنے کی خاطر مذہبی علامات استعمال کئے۔ذولفقار علی بھٹو نے بھی سیاسی مجبوریوں کے آڑ میں یہی سب کچھ کیا۔ برطانوی منتظمین کی طرح پاکستان کی حکومت میں رہنے والے اشرفیہ نے بھی ملک کی اکثریت کو جاہل اور پس ماندہ تصور کیا جنھیں وہ سمجھتے تھے کہ مذہبی جذبات کے سہارے اپنے تابع کیا جاسکتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک اسلامی ریاست قدرتی طور پر پاکستانی عوام کی اکثریت کی خواہشات کی ترجمانی کرتی ہے۔ [40]

---

[39] جان ایل ایپوسٹو، '' اسلامی نظریہ اورپاکستانی سیاست''

[40] مارکس ڈیجسٹ، ''پاکستان میں فوجی اسلامائزیشن'' جولائی ۱۹۹۷

تاہم جنرل ضیا الحق اپنے تما م پیش روں سے آگے نکل گئے اگرچہ نظریاتی حوالے سے نہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان کے اپنے ذاتی مذہبی خیالات کیا تھے ایک بات طے ہے کہ انھوں نےمذہب کو اپنے مفادات کی خاطر آخری درجے تک استعمال کیا کیوں کہ وہ اپنے پیش روں کے مقابلے میں زیادہ کٹھن سیاسی حالات میں گھیرے ہوئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ عام پاکستانی فطری طور پر مذہبی ہے اور ایک اسلامی ریاست اس کے خواہشات کے مطابق ہوگا۔ چند سال قبل ملک کے ٹوٹنے اور مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش کے بننے کے بعد بلوچستان کا مسئلہ پیدا ہونے کے بعد فوجی حکومت کو لگا کہ اسلام ایک ایسی قوت ہے جو ملک کوآپس میں جوڑ سکےگی۔

انیس سو اسی کے شروعات میں اسلام کا فروغ خاص طور پر دراصل بنگلہ دیش کی علیحدگی کے جواب میں شروع ہوا کیو ں کہ وہ (بنگلہ دیش کی جدائی) اب بھی پاکستانی پالیسی سازوں کو یاد رہتی ہے۔ ضیا نے کوشش کی کہ بلوچوں اور دیگر قومیتوں کو اسلامی شناخت میں جذب کرے۔لیکن بلوچ ثابت قدم رہے اور جن جن علاقوں میں بلوچوں کی اکثریت آباد تھی وہاں پاکستان کی اسلامی پالیسیاں ناکام ہوگئیں۔ تاہم یہ کوششیں ہمیشہ کے لئے وفاقی حکومت کے دیرپابلوچستان پالیسی کا حصہ رئیں۔ ضیا نےجلاوطن بلوچ قوم پرست رہنماوں کے ساتھ ضروری سمجھوتے کئے جس کے نتیجے میں بلوچستان عارضی طور پر پرامن رہا۔ اس دوران بلوچستان کے پشتون علاقوں میں مذہبی جما عتیں مضبوط ہوگئیں جس کی ایک وجہ سوویت یونین کے افغانستان کے نتیجے میں پشتون علاقوں میں مہاجرین کی تعداد میں غیرمعمولی تعداد میں بلوچستان آنا تھا۔

جنرل مشرف اپنی روشن خیال اعتدال پسندی کے دعووں اور صوبوں کی شکایات کو ختم کرنے کے وعدوں کے باوجود اسلامائزیشن کے حوالے سے ضیا کی پالیسوں کے نقش و قدم پر چلتے رہے(اگرچہ ان کی صوبائی پالیسی بڑی حد تک ایوب خان اور ذولفقارعلی بھٹو سے لیا گیا تھا)۔ [41]

مشرف حکومت نے وزارت مذہبی امور کے زیر اہتمام بلوچستان میں مدارس کے قیام کی حوصلہ افزائی کی تاکہ بلوچ علاقوں میں مدارس پروان چڑھیں کیوں کہ بلوچوں نے سختی سے ملاوں کی مخالفت کی۔ نئے مدارس سیکولر تعلیم کی قیمت پر آئے جس کے نتیجے میں ملاوں کے اثر ورسوخ میں اضافہ ہوا جس پر بلوچ اور پشتون قوم پرست بہت ہی ناخوش تھے۔ دنوں (بلوچ اور پشتون) تحاریک نے مطالبہ کیا ہے کہ وزارتِ مذہبی امور کو ختم کیا جائے۔

[41] اس سلسلے میں دیکھیں، انٹرنیشنل کرائسس گروپ کی رپورٹ، '' پاکستان کا بگڑتا ہوا بلوچستان تنازعہ''

دلچسپ بات یہ ہے کہ مذہبی قوتوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے پیش نظروفاقی حکومت نے بین الاقوامی قوتوں کی توجہ حاصل کرنے کی خاطر یہ گمراہ کن مہم شروع کی کہ بلوچ قو م پرستوں کا تعلق اسلامی دہشت گردوں سے ہے اور ان کی وجہ سے خطے میں بنیاد پرستی کے پھیلنے کے خطرات ہیں۔ذرائع ابلاغ میں شائع ہونے والی رپورٹس میں القاعدہ، طالبان اور بلوچ قوم پرستوں کی طرف سے کی جانے والی کارروائیوں کو ایسے دیکھایا گیا گویا وہ ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ اسی طرح اس گمراہ کن مہم کے ذریعے بلوچ تحریک کو ایک ایسے وقت میں ایران کے اسلامی انقلاب کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی گئی جب امریکہ اور یورپ بڑی سختی سے تہران کے جوہری عزائم کی مخالفت کر رہے تھے۔

فرقہ واریت کا غیر معولی عروج

قوم پرستوں اور اسلامی جماعتوں کے درمیان جو اختلافات ضیا الحق کے دور اقتدار میں شروع ہوئیں اور ان کے بعد آنے والے حکومتوں میں بھی جاری رئیں نظریاتی بنیاد پر نہیں تھیں۔ اس کو فوجی حکومتوں نے نظریاتی شکل اس لئے دی ہوئی تھی کہ لسانی شناخت کا خاتمہ کیا جائے اور تمام اختیارات مرکزی حکومت کے حوالے کئے جائیں۔ بلوچستان میں اسلامائزیشن کو مسترد کرنے کا مطلب خود اسلامی نظریہ کی مخالفت کرنے کے مترادف نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد اختیارات کے مرکزیت اور مرکز کی بالادستی کی مخالفت کرنا تھا۔

اسی طرح بلوچ قوم پرستوں نےاسلامائزیشن کی پالیسوں کو نظریاتی بنیادوں پر مسترد نہیں کیا بلکہ انھیں پتہ تھا کہ اس کے پس پردہ اور عزائم ہیں جن کے ذریعے ریاست چاہتی تھی کہ لوگوں کو اسلام آباد کی پالیسوں کا حامی بنا لے۔ تاہم ان دنوں اسلامائزیشن کاعمل بلوچستان میں بڑی تبدیلی دیکھ رہی ہے۔بلوچستان میں لاقانونیت کے ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دیوبندی مدارس سے منسلک فرقہ وارانہ تنظیموں نے آگے بڑھ کر خطے میں اپنی سرگرمیوں میں ا ضافہ کیا ہے اور بڑی حد تک شدت پسندی پھیلایا ہے۔ چند سالوں میں ایک ایسے صوبے میں جو اپنی سیکولر روایات کی وجہ سے جانا جاتا تھا وہاں فرقہ وارانہ قتل و غارت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔

مشرف کے دور حکومت میں بلوچستان میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت کی معاونت سے طالبان کی موجودگی کو مضبو ط بنایا گیا۔صوبہ بڑی تیزی سے فرقہ وارانہ تنظیموں کے جوڑ توڑ کا مرکز بن چکا ہے۔کہا جا تا ہے کہ افغان اور پاکستانی طالبان (تحریک طالبان بلوچستان)، القاعدہ، لشکرِ

جھنگوئی، سپاہ صحابہ پاکستان ، امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن اور سپاہ محمد صوبہ میں موجود ہیں۔ ان کی موجودگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پاکستان کی سیکورٹی اسٹبلشمنٹ انھیں پنجاب سے نکال کر بلوچستان کی طرف دھکیل رہی ہے اور دوسری وجہ جزوی طور پر دیوبندی مدارس کا وسیع نیٹ ورک ہے۔[42] اس کے علاوہ یہ ستر کی دہائی میں وفاقی حکومت کی طرف سے اسلامائزیشن کو فروغ دینے کا نتیجہ ہے۔ چند تجزیہ نگار کہتے ہیں کہ بلوچستان میں قائم افغان مہاجرین کے کیمپ طالبان کے لئے نئے جنگجو بھرتی کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔[43]

بلوچستان کی فرقہ وارانہ تنظیمیں بدستور ایک دوسرے کے ساتھ بڑھتی اور پھیلتی جارہی ہیں اور ان کے درمیان ڈرامائی انداز میں تعاون میں اضافہ ہورہا ہے۔ سپاہ صحابہ پاکستان کو بلوچستان میں بڑی حمایت حاصل ہے۔ اگرچہ اس پر حکومت نے دو مرتبہ پابندی عائد کی ہے لیکن اس کے باوجود یہ تنظیم لشکرِ جھنگوئی کے دہشت گردوں کو زمینی معاونت فراہم کرتی ہے۔ یہ تنظیم عثمان کرد اور قاری حئی گرپوں کے نام سے کارروائیاں کرتی ہے۔کالعدم لشکرِ محمد نے لشکرِ جھنگوئی کے ساتھ آپریشنل تعلقات قائم کئے ہیں جب کہ اس کے علاوہ حرکت المجاہدین اور حرکت اسلامی جیسی تنظیموں کے بڑے حصے بھی ا س میں شامل ہوگئے ہیں۔ امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا شعیہ نوجوانوں اور شعیہ سیاست پر خاصہ اثر و رسوخ ہے اور یہ تنظیم بھی فرقہ وارانہ تشدد کو ہوا دینے میں بھی اپنا کردار ادا کرتی ہے۔[44]

سب سے قابل تشویش امر بلوچستان میں مذہبی انتہاپسندی کے بدلتے ہوئے رجحانات ہیں۔ پشتون علاقوں کے مقابلے میں بلوچ علاقہ ماضی قریب میں بڑا سیکولر مانا جاتا تھا ۔ آج تبلیغی جماعت پشتون علاقوں کے باہر اپنی سرگرمیاں منعقد کرتی ہے۔ لشکر جھنگوئی بلوچ علاقوں سے بھرتی کر رہی ہےاور بلوچستان میں تنظیم کے پانچ اہم ترین رہنما بلوچ ہیں۔

جنرل مشرف کے بعد بلوچستان میں حالات مزید خراب ہوگئے کیوں کہ مذہبی سرگرمیاں اور سیاست انتہاپسند ی میں بدل گئے۔ جمعیت علمااسلام صوبائی حکومت کو تو نہیں چلارہی لیکن مذہبی انتہا پسند جماعتیں فوج کی صوبائی پالیسی کا اٹوٹ حصہ بن چکی ہیں۔

---

[42] محمد عامر رانا، '' پھیلتا ہوا اتحاد''، دا نیوز انٹرنیشنل، ۲۹، جولائی ۲۰۱۲

[43] صفدر سائل اور عبدالباسط، '' بلوچستان میں تنازعہ اور بد امنی''، پاکستان انسٹیٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز، اکتوبر ، دسمبر ۲۰۱۰

[44] ''بڑھتا ہوا اتحاد'' فرائیڈے ٹایمز ۳ اگست ۲۰۱۲

بلوچستان میں فرقہ وارانہ واقعات بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں جن کا ہدف زیادہ تر اوقات ہزارگی بولنے والےاور شعیہ مسلک سے تعلق رکھنے والے ہزارہ برادری کے لوگ ہیں جو کہ افغانستان اور پاکستان میں رہتے ہیں۔یہ مسئلہ پاکستان میں نیا نہیں ہے۔ سال انیس سو اٹھانوے سے لے کر سال دوہزار نو تک سات سو ہزارہ کو قتل کیا گیا لیکن سال دوہزار دو تک بلوچستان میں اس طرح کے کم واقعات پیش آتے تھے۔ جب مشرف نے سپاہ صحابہ پاکستان اور جیش محمدپر پابندی عائد کی تو یہ تنظیمیں بلوچستان میں جانے پر مجبورہوگئیں جہاں انھوں نے طالبان جنگجووں کے ساتھ اپنے روابط قائم کر لئے۔

جنوری دوہزار نو میں ہزارہ ڈیموکریٹک پارٹی کے چئیرمین کی ہلاکت کے بعد ہزارہ کی ٹارگٹ کلنگ میں اضافہ ہوا۔ بیس ستمبر دوہزار گیار ہ کو بیس شعیہ زائرین جو ایران جارہے تھے کو مستونگ کے علاقے میں ان کے اہل خانہ کے سامنے گولیاں مارکر ہلاک کیا گیا۔تین روز بعد تین اور ہزارہ کوئٹہ سے باہر ہلاک کئے گئے جب کہ چار اکتوبر کو تیرہ ہزارہ کو بس سے گھسیٹ کر نکالا گیا اور گولیاں مار کر ہلاک کردیا گیا۔ یہ سلسلہ سال دوہزار بارہ میں متواتر جاری رہا۔ [45]

صرف شعیہ ہی فرقہ وارانہ گروہوں کے اہداف میں شامل نہیں ہیں بلکہ لشکر جھنگوئی نے بلوچ قوم پرست رہنما حبیب جالب بلوچ کو بھی قتل کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ لشکر جھنگوئی شعیوں کے قتل سے انکار کرتی ہے اور کہتی ہے کہ اس کا مقصد دراصل بلوچ برادری کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔ کچھ رہنما اپنی کارروائیوں کو دفاعی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کے خلاف کرتے ہیں جنھیں غیر ملکی خفیہ اداروں کی حمایت حاصل ہے۔[46]

کچھ تجزیہ نگار کہتے ہیں کہ سپاہ صحابہ اور لشکر جھنگوئی کو سرکاری تحفظ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑے شہروں میں جلسے جلوس منعقد کرتے ہیں اور کھلے عام اسلحہ کی نمائش بھی کرتے ہیں۔ زیادہ تر حملے ان جگہوں میں پیش آتے ہیں جہاں فرنٹئیر کور سختی سے موجود ہے۔ فرقہ وارانہ کارروائیوں میں اس لئے اضافہ ہوا ہے کہ ان تنظیموں کو پکڑے جانے کا کوئی خوف و خطر نہیں ہےا ور ان کے لئے ہر جگہ کارروائی کرنے آسان ہوگیا ہے۔[47] پولیس اور عدالتوں کے پاس یہ صلاحیت

---

[45] ہما یوسف، ''فرقہ وارانہ تشدد: پاکستان کو درپیش سب سے بڑا سیکورٹی خطرہ''نورف سوسائٹی، مئی ۲۰۱۲

[46] سید شعیب حسن، '' بلوچستان میں فرقہ وارانہ انتہاپسندی کا فروغ''، ڈان، ۱۱ اپریل ، ۲۰۱۲

[47] کٹجا رکونین، ''سکٹ ان اسٹون''، ہیرالڈ، ۱۶ اکتوبر، ۲۰۱۲

ہی نہیں ہے کہ وہ فرقہ وارانہ قتل و غارت میں ملوث افراد کو پکڑ کر ان کے خلاف مقدمات چلائیں اور انھیں سزائیں دیں۔ خفیہ ادارے بھی انھیں کارروائی کرنے سے نہیں روک پاتیں۔

شعیہ رہنما خفیہ اداروں کے ساتھ ساتھ صوبائی بلوچ حکومت کے اہم اراکین پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ فرقہ وارانہ تنظیموں کے رہنماوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ملوث ہیں۔ جو تنظیمیں فرقہ وارانہ کارروائیوں میں ملوث ہیں وہ اس بات پر مطمئن ہیں کہ مئی دوہزار تیرہ کو ہونے والے پارلیمانی انتخابات سے قبل ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔

چند بلوچ رہنما خفیہ ادراوں پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ بلوچ اورمذہبی عناصر کو بیک وقت استعمال کرکےہزارہ کو قتل کر رہے ہیں جس کا مقصد بلوچ قوم پرست تحریک کو دبانا ہے۔ اسی دوران خفیہ ادارے یہ تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں کہ بلوچ برادری ہی ہزارہ کو نشانہ بنارہی ہے۔ بذات خود حکومت نے کوشش کی ہے کہ لشکرِ جھنگوئی اور بلوچ لبریشن آرمی کے درمیان تعلق جوڑ دے۔ وزیر داخلہ رحمان ملک نے سینٹ کو بتایا کہ پچھلے پانچ سالوں سے دونوں تنظیم ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔[48]

اگر بلوچ رہنماوں کے خدشات درست ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ بلوچستان میں سیکورٹی اسٹبلشمنٹ صرف جمعیت علما اسلام اور اس جیسی دیگر بنیاد پرست جماعت پر انحصار نہیں کرتی ۔ ایک ایسے وقت میں جب اسٹبلشمنٹ کے لئے مشکل ہو گیا ہے کہ جن گرہوں کو اس نے ماضی میں قائم کیا اور وہ ان کے قابو سے باہر نکل گئے ہیں پھر اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اسی طرح کی تنظیموں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال میں لایا جارہا ہے۔

آگے کا راستہ

آیا بلوچستان کے حالات نارمل ہو جائیں گے یا نہیں اور کیا بد امنی کا جو موجودہ ماحول ہےاسے بہتر کیا جاسکے گا یا نہیں ایک کھلا سوال ہے۔ موجودہ غیر مستحکم حالات بلاشبہ صوبے کو مزید لاقانونیت کی طرف دھکیل دیں گے جنھیں بہتر بنانا مشکل ہی نہیں بلکہ اس کے لئے کئی نسلیں درکارہوں گی۔ان حالات سے باہر نکلنے کے لئے چند باتیں اہم ہیں۔

[48] اعجاز کاکا خیل، ڈایلی ٹائمز، ۳ اگست ۲۰۱۲

اول، بلوچوں کی اکثریت آزادی نہیں بلکہ زیادہ تر خود مختاری چاہتی ہے۔ جولائی دوہزار بارہ کو منعقدہ ایک سروے کے مطابق، صرف سینتیس فی صد بلوچ اور بارہ فیصد پشتون آزادی کے حق میں ہیں۔ تاہم ٦٧ فی صد لوگ زیادہ تر خود مختار ی کے حق میں ہیں۔[49]

یہ اعداد و شمار بلوچستان کے مستقبل کا فیصلہ نہیں کرتے۔ جو ٣٧ فی صد بلوچ آج آزادی کی حق میں ہیں ان کی تعداد میں مستقبل میں اضافہ ہوسکتا ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ ان اعداد و شمار کا مطلب ہے کہ وہ قومی دھارے میں آنا بھی چاہتے ہیں ۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ بلوچستان محض امن و امان کا ایک مسئلہ نہیں ہے اور اب بھی سیاسی مذاکرات کے لئے گنجائش ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ سمجھوتے کے امکانات اب بھی موجود ہیں۔

اگر پاکستان کے انگریزی پریس کے نقطہِ نگاہ سے دیکھا جائے تو لگتا ہے کہ باقی ماندہ پاکستان میں بلوچستان کے لئے مثبت سوچ پایا جاتا ہے۔[50] انیس سو ستر کے برعکس جب بلوچوں کا مسئلہ صرف ان ہی تک محدود رہا اب پاکستانی سماج میں بلوچستان پر وسیع پیمانے پر بحث و مباحثے ہوتے ہیں۔پاکستانی میڈیا خاص کر الیکٹرانک میڈیا کا فی مضبوط ہوگیا ہے اور اس کا اچھا خاصا اثر پایا جاتا ہے۔ چند اخبارات کو چھوڑ کر باقی قومی انگریزی اخبارات میں اس بات کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ بلوچستان میں علیحدگی پسند جذبات اپنی عرو ج کو پہنچ گئے ہیں جس کی وجہ فوج اور نیم فوجی دستوں کی کارروائیاں ہیں جن پر یہ الزام بھی لگتا ہے کہ وہ باقاعدہ طور پر بلوچ کارکناں کو اٹھانے، ٹارچر اور قتل کرنے میں ملوث ہیں۔ یہ خیالات صرف بلوچ میڈیا میں نظر نہیں آتے (حالاں کہ بلوچ میڈیا ایک منصوبے کے پابندیوں کا شکار ہے۔ سیکورٹی فورسز اور ان کے معاون صحافیوں کو نشانہ بناتے ہیں جس سےیہ تاثر لیا جاسکتا ہے کہ سکیورٹی اسٹبلشمنٹ اس بات سے خوف زدہ ہیں کہ بلوچ میڈیا کا اثر بلوچستان سے با ہر نہ پہنچے)۔

انگریزی پریس اس بات کا اعتراف بھی کرتا ہے کہ سویلن حکومت کے پاس بلوچستان کے مسئلے کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں ہےخاص طور پر اس لئے کہ صوبائی حکومت خاصا کرپٹ اور بے اختیار ہے۔[51] صوبائی اہل کار ذرائع ابلاغ پر تنقید کرتے ہیں کہ وہ بلوچستان میں امن و امان کے

---

[49] انصار عباسی، ''٣٧ فیصد بلوچ آزادی کے حق میں ہیں: برطانوی سروے''، دا نیوز، ١٣ اگست، ٢٠١٢

[50] '' کوئی سازشیں نہیں، براہ مہربانی''، ایکسپریس ٹریبیون، ٦ جون، ٢٠١٢

[51] ''بلوچستان لہولہان ہے''، دا نیوز، ٢٥ جون، ٢٠١٢

حوالے سے مایوس کن تصویر پیش کرتے ہیں تاہم ان کے پاس ایسےدلائل نہیں ہیں جن کی بنیاد پر وہ ذرائع ابلاغ کے دعووں کو غلط ثابت کرسکیں۔[52]

یہ اندازہ لگانا قدرے مشکل ہے کہ انگریزی پریس میں حکومت پر جس طرح تنقید کی جاتی ہے وہ کتنے لوگوں کی رائے کی ترجمانی کرتا ہے لیکن ایک بات واضح ہے کہ جس طرح وہ بلوچستان کی سماجی و معاشی محرومیوں پر آواز اٹھاتے ہیں اس سے اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ بلوچوں کے لئے کسی حد تک حمایت موجود ہے اور اس معاملے پر پاکستان میں یکجہتی پائی جاتی ہے۔ اس سے پاکستانی سول سوسائٹی اور فوج کے درمیان پائے جانے والے خلیج کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔

سوئم، بلوچ قوم پرست تحریک منقسم ہے اور اس کی یہ پوزیشن نہیں ہے کہ وہ آزادی حاصل کرسکے۔ بلوچ قوم پرست وقتاً فوقتاً آپس میں لڑتے ہیں جس کے نتیجے میں سخت گیر موقف رکھنے والے قوم پرست ان بلوچوں کے سامنے کھڑے ہوجاتے ہیں جو بحران کو سیاسی گفت و شنید کے ذریعے حل کرنا چاہتے ہیں۔اگرچہ مزحمت کار پاکستانی فو ج اور ان کے حامیوں کو تنگ کرسکتے ہیں لیکن ان کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں جن کو لے کر وہ پاکستانی سیکورٹی فورسز پر غالب ہوں۔ پاکستانی اہل کاروں کے الزامات کے باجود ایسا نہیں لگتا کہ مزحمت کاروں کو اتنی زیادہ غیر ملکی حمایت حاصل ہے کہ وہ صوبے میں طاقت کے توازن کو اپنے حق میں بدل دیں۔

چہارم، سیکورٹی اسٹبلشمنٹ بغاوت کو کچل نہیں سکتی اور اس سے نمٹنے کے لئے جو طرائق استعمال کئے جارہے ہیں اس سے حالات مزید بگڑجائیں گے۔ اور سیکورٹی اسٹبلشمنٹ اکیلے نہیں لیکن بڑی حد تک تشدد میں اضافہ کا ذمہ دار ہے ۔معروضی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تحریک کے اہم ترین رہنما ہلاک کئے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود بغاوت ختم نہیں ہوسکی ہے۔

پنجم ، اگرچہ سپریم کورٹ سیکورٹی فورسز کو قانون کا احترام کرنے پر مجبور نہیں کرسکی ہے لیکن اس نے بلوچستان کے مسئلے کو اجاگر کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ مسئلے کے شروع سے لے کر اب تک سپریم کورٹ نے بلوچستان کے معاملے پر ستر سماعت منعقد کئے ہیں جن میں حکومت کی نااہلی کے پیش نظر یہ احکامات جاری کئے کہ صوبے میں قانون اور آئین کی بالادستی قائم کی جائے۔[53]سپریم کورٹ کے کسی بھی حکم کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ ان سماعتوں کے دوران خود

---

[52] ''وزیراعلیٰ میڈیا میں بلوچستان کی عکس کشی پر خوش نہیں ہیں''، ڈان ، ۱۸ جولائی، ۲۰۱۲

[53] محمد ظفر، ایکسپریس ٹریبون،۱۱، اکتوبر، ۲۰۱۲

سپریم کورٹ نے اپنی نا لائقی دیکھائی ہے کہ کس طرح سیکورٹی اسٹبلشمنٹ کا احتساب موجود نہیں ہے۔ تاہم سپریم کورٹ کے سماعت کسی حد تک مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ ان سماعتوں نے پاکستانی ذرائع ابلاغ، رائے عامہ اور بین الاقوامی برادری کو بلوچستان کے معاملے پر کسی بھی سرکاری ادارے کے مقابلے میں زیادہ تر آگاہی فراہم کی ہے۔

ان حالات کو مد نظر رکھا جائے تو کیا اس کے باوجود بلوچستان میں سیاسی مذاکرہ کی گنجائش موجو د ہے؟ یہ بات سب کو پتہ ہے کہ سخت گیر موقف رکھنے والے قوم پرست اسلام آباد کے ساتھ مذاکرات نہیں کرنا چاہتے لیکن یہ بات بھی غیر واضح ہے کہ آیا معتدل موقف رکھنے والی سیاسی جماعتیں انتخابات میں حصہ لے کر انتخابی سیاست میں دوبارہ داخل ہونا چاہتی ہیں یا نہیں۔ ستمبر دوہزار بارہ کو اپنے مختصر دورہ اسلام آباد کے دوران بلوچستان نیشنل پارٹی کے صدر اختر مینگل نے حزب اختلاف کی دو بڑی جماعتوں کے سربراہان یعنی پاکستان مسلم لیگ کے سربراہ اور سابق وزیراعظم نواز شریف اور پاکستان تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان سے ملاقاتیں کیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ شاید مینگل سیاسی مذاکرات کے لئے تیار ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پاکستان مسلم لیگ نواز نے ان کا نام نگران وزیراعظم کے لئے بھی تجویز کیا جسے مینگل نے مسترد کردیا۔ قومی جماعتوں اور قوم پرستوں کی اولین ترجیح یہ ہے کہ صوبے میں امن و امان کی صورت حال بہتر ہواور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہاتھوں انسانی حقوق کی پامالی رک جائے۔

مینگل نے پاکستان کے ساتھ ''پر امن طلاق'' یعنی بلوچستان میں حقِ خود ارادیت پر ریفرنڈم کی پیشکش کی ہے۔ فوجیوں کی جانب سے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی نے اس تجویز پر کہا کہ فوج بلوچستان کے مسئلے کے سیاسی حل کی حمایت کرے گی بشرطیکہ یہ مطالبہ آئین پاکستان کے مطابق ہو اور انھوں نے مزید کہا کہ کوئی بھی قدم جو کہ آئین کی خلاف ورزی کرتا ہو ناقابل قبول ہوگا۔[54]

بلوچستان کے مسئلے کے کسی بھی سیاسی حل کے لئے قوم پرستوں کو شامل کرنا لازمی ہے اور آنے والے عام انتخابات میں ان کی شمولیت بلوچستان کے مسئلے کے حل کا ایک اہم جز ہوگا۔اگر قوم پرست

[54] ''فوج بلوچستان میں مسئلے کے حل کے لئے آئینی حل کی حمایت کرے گی: کیانی'' ڈان، ۳، اکتوبر، ۲۰۱۲

انتخابات میں حصہ لیں گے تو صوبائی حکومت کی قانونی حیثیت بلاشبہ زیادہ ہوگی اور ان کی شمولیت سے صوبے کو پرامن بنانے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔ چند قوم پرست جماعتیں انتخابات میں حصہ لینے پر بحث کررہی ہیں۔ تاہم وہ ایسا صرف اس وقت کریں گی جب انھیں ایک ہموار میدان فراہم کیا جائے۔اگر وہ ایک بار پھر انتخابات کا بائیکاٹ کریں گے تو حالات مزید خراب ہوں گے کیوں کہ ان کی عدم شمولیت سے آنے والی حکومت جائز نہیں ہوگی۔

کوئی بھی سیاسی حل اس وقت تک دیر پا نہیں ہوسکتا جب تک انسانی حقوق کی صورتحال میں بڑے پیمانے میں بہتری نہیں آتی اور ہر بلوچ شہری کے تحفظ کی ضمانت نہیں دی جاتی۔ لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ امن قائم کرنے سے پہلے سیکورٹی اسٹبلشمنٹ اعتماد کی فضا قائم کرنے کے لئے اپنی مارو اور پھینک دو کی پالیسی ترک کرنے، جبری گمشدگیوں اور ڈیتھ اسکوڈ کے خاتمے کے لئے تیار ہے یا نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب تک افغانستان سے افوا ج کا انخلا مکمل نہیں ہوتا اس وقت تک بین الاقوامی برادری بلوچستان کے مسئلے پر زیادہ توجہ نہیں دےگی۔ چوں کہ مختلف ممالک افغانستان میں موجود افواج کی سپلائی اور وہاں سے نکلنے کے لئے پاکستان کے راستوں پر انحصار کرتے ہیں وہ ان حالات میں پاکستانی فوجی اسٹبلشمنٹ کو للکارنے کے متحمل نہیں ہوسکتے اور ایک طرح سے یہ صورت حال ان کی کمزوری بھی ہے۔

اس تناظر میں اقوام متحدہ اور اس کے دیگر ذیلی اداروں کی جانب سے بلوچستان میں انسانی حقوق کی صورت حال کا جائزہ لینے سے محدودپیمانے لیکن موثر انداز میں (پاکستان پر) دباو بڑھایا جاسکتا ہے۔ لیکن ایسا عمل شروع کرنے کے لئے قتل و غارت اور جبری گمشدگیوں کا سلسلہ فوری طور پر روک دینا لازمی ہے۔فوج کی طرف سے ایف سی اور دیگر پروکسی قوتوں کو اختیارات منتقل کرنے کا مطلب ہے کہ خود فوج بلوچستان میں اپنی پالیسوں سے مطمئن نہیں ہے۔ بین الاقوامی مانیٹرنگ کا یہ نہ صرف یہ فائدہ ہوگا کہ فوج کی حامیوں نے جو انسانی حقوق پامال کئے ہیں وہ سب کے سامنے عیان ہوں گے بلکہ اس پالیسی کو بدلنے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔اگر فوج سنجیدگی سے صوبے میں امن و امان بحال کرنا چاہتی ہے تو مانیٹرنگ سے اس عمل کا ساکھ بہتر ہوگا اور اس سے فوج کےوقار کو بھی بحال کرنے میں مدد ملے گی۔

اگر راولپنڈی (یعنی فوج) کے سوچ میں تبدیلی آتی ہے تو اقوام متحدہ کی مانیٹرنگ سے مختلف فریقین کے مابین موجودبد اعتمادی ختم ہوجائے گی۔جب اقوام متحدہ عالمی معیار پر (نا کہ کسی مخصوص

قومی سیاسی ایجنڈے کی بنیاد پر) بلوچستان میں پاکستانی ریاست کی پالیسوں کا جائزہ لے گی تو یہ شاید یہ پاکستانی سیکورٹی اسٹبلشمنٹ کو بھی قابل قبول ہو۔

اس تناظر میں ستمبر دوہزار گیا رہ میں اقوام متحدہ کے مشن نے جو کام کیا اس کی اہمیت کو دیکھنا اور سمجھنا چائیے۔ اس مشن نے بلوچستان میں دس دن گزارے اور بلوچستان میں لاپتہ افراد کے بارے میں تحقیق کرنے کے لئےحکومتی اہلکاروں اور سو کے لگ بھگ شہریوں سے ملاقات کی۔ [55]مشن حکومت پاکستان کی دعوت پر آئی تھی جو بذات خود ایک طرح سے بے الفاظ میں حکومت کی جانب سے اس بات کا اعتراف تھا کہ سرکاری سطح پر انکار کے باوجود(بلوچستان میں) ایک مسئلہ موجود ہے۔ یہ حیران کن بات نہیں تھی کہ پاکستانی انٹر سروسز انٹیلی جنس اور نیم فوجی دستہ ایف سی نے مشن سے ملنے سے انکار کیا حالاں کہ جبری گمشدگیوں کے حوالے سے سب سے زیادہ الزام ان ہی پر لگایا گیا ہے ۔ اقوام متحدہ کے مشن سے ملاقات سے انکار ان کی سابقہ پالیسی کا تسلسل تھا کہ وہ ان کارروائیوں میں ملوث نہیں ہیں۔

بنیادی طور پر اقوام متحدہ کا مشن ایک ایسی کوشش تھی جس کا مقصد جبری گمشدگیوں کے معاملے پر بین الاقوامی توجہ مبذول کرنا تھا۔ اسی طرح امریکہ اور برطانیہ نے اقوام متحدہ کے کونسل برائے انسانی حقوق کے انیسویں سیشن میں بلوچستان میں انسانی حقوق کی صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا۔ [56]

اقوام متحدہ ایک ارتقائی کردار ادا کرسکتی ہے۔ اگر سیاسی جماعتیں اور سیکورٹی اسٹبلشمنٹ امن پر آمادہ ہوجاتی ہیں تو اقوام متحدہ امن کی ضامن بن سکتی ہے اور دنوں فریقین کےدرمیان اعتماد بحال کرنے کے ساتھ ساتھ موجود ہ بحران سے نکلنے کے لئے ایک عملی راستہ بھی فراہم کرسکتی ہے۔

اختتامیہ

بلوچستان میں لاقانونیت محض ایک غیر مستحکم خطے میں بدقسمتی کی بات نہیں ہے۔جس طرح وہ تمام سماجی ادارے جو کہ انتہا پسندی کا راستہ روک سکتے ہیں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تباہ کردیئے گئے ہیں اس سے ایک ایسے خطے میں اقتدار کا بحران اور تباہ کن صورتحال پیدا ہوگیا ہے جو کہ افغانستان کے سب سے غیر مستحکم صوبوں ہلمند اور قندھار کے بالکل قریب واقع

[55] ڈیکلن والش، ''اقوام متحدہ کا پاکستان کو سینکڑوں لاپتہ افراد کا معاملہ حل کرنے کا مطالبہ''، نیویارک ٹائمز، ۲۱، اکتوبر، ۲۰۱۲
[56] بلوچ اقوام متحدہ میں امریکہ کی حمایت کا خیر مقدم کرتے ہیں، تامل گاڑین، ۲۸ مارچ، ۲۰۱۲

ہے۔ یوں لگتا ہے کہ دوہزار چودہ کے بعد کوئی بھی ریاست ان غیر مستحکم علاقوں پر اپنی گرفت قائم نہیں کرسکے گی اور جن گروہوں کو ختم کرنے کی خاطر امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا وہی گروہ ایک بار پھر اس خطے میں مضبو ط ہوں گے۔

وہ وقت گزر چکا ہے جب صرف سماجی و معاشی نا انصافیوں کے ازالہ سے بلوچستان کا مسئلہ حل ہوسکتا تھا۔ اگرچہ یہ مطالبا ت اب بھی اپنی جگہ پر ہیں لیکن جو سیاسی جماعتیں پاکستان کے فریم ورک میں رہ کر اپنے حقوق کی بات کررہی تھیں ان کو بھی ریاست نے اتنا دبا یا اور مجبور کیا کہ وہ اپنے موقف میں سختی لائیں۔ایسے لگتا ہے کہ پاکستان کی سیکورٹی اسٹبلشمنٹ نے بلوچ قوم پرستی کی سوچ کو جڑ سے اکھاڑنے کا عزم کررکھا ہےاس بات سے قطع نظر کہ ان کا موقف کیا ہے۔ وہ بلوچ جنھوں نے اپنا موقف سخت نہیں کیا اور نہ ہی پاکستان کی سیکورٹی اسٹبلشمنٹ انھیں کبھی خرید سکی انھیں دنوں(سکیورٹی اسٹبلشمنٹ اور سخت گیر موقف رکھنے والے بلوچ قوم پرست) مسترد کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ کا سیاسی حل تلاش کرنے اور تلخیاں ختم کرنے کے لئے ایک نیک شگون نہیں ہے۔

اگرچہ بلوچستان کے لوگوں کے دلوں میں اسلام آباد کے لئے جتنا بھروسہ تھا وہ ختم ہوچکا ہے لیکن صرف ایک اقلیت(تاہم اہم حصہ) آزادی کے حق میں دیکھائی دیتی ہے۔اس کا مطلب ہے کہ سیاسی گفت و شنید کے لئے کم ہی سہی لیکن گنجائش اب بھی موجود ہے لیکن یہ اس بات کی ضامن بھی نہیں ہے کہ مذاکرات کبھی شروع ہوں گے بھی یا نہیں۔ چوں کہ بلوچوں کی اکثریت اپنا مستقبل پاکستان کے وفاق میں دیکھتی ہے تو یہ خیال درست نہیں ہے کہ پاکستان کی یکجہتی کو کوئی سنگین خطرہ ہے۔ تلوار کی نوک سے بلوچستان کے مسئلے کو حل کرنے میں ناکام ہونے کے بعد اسلام آباد کو احساس ہونا چائیے کہ پاکستان کے مختلف مسائل کا حل سیاسی طرائق سے نا کہ جبر اور طاقت کے استعمال سے ممکن ہے۔ اگر مسئلے کا کوئی حل ڈھونڈنا ہے تو اسے سیاسی ہی ہونا ہے بصورت دیگر دوہی راستے سامنے ہیں۔ یا تو سب لوگ ملکی دھارے میں شامل ہوجائیں گے یا مکمل ٹو ٹ پھوٹ ہوگی۔

بلوچستان میں فوج چاہتی تھی کہ روایتی مقامی ڈھانچہ کو تباہ کرکے اپنی طاقت جمالے جس میں وہ بلاشبہ کامیاب ہوگئی ہے لیکن ایسا کرتے کرتےفو ج نے پاکستانی ریاست کو بہت کمزور بنادیا ہے اور سخت گیر رہنماوں کے موقف کو تقویت دی ہے۔ بالفاظِ دیگر بلوچستان میں جو کچھ ہوا ہے وہ پاکستان کے مجموعی حالات کا عکس ہے۔